بزمِ حافظ شیرازی

کاشی ناتھ پنڈت

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب
سرینگر کشمیر

بزمِ حافظ شیرازی

انتساب

میں اس تحقیقی کاوش کو اپنے عالم و فاضل استاد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے نام معنون کرتا ہوں۔ وہ اب اس دُنیا میں نہیں رہے۔ فارسی شعر و ادب اور ایران کی ادبی اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ اور تحقیق کا ذوق و شوق مجھے اُن کی ہی دین ہے۔ میں استاد صفا کے گنتی کے اُن خوش قسمت شاگردوں میں سے ہوں جنھیں اُن کے سامنے زانوے تلمذتہ کرنے کا نادر موقعہ ملا۔ مجھ ہیچمدان کو فن و تدقیق کا اگر عشر عشیر نصیب ہوا ہے وہ اسی نابغہ روزگار استاد کی عنایات کا نتیجہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بزم خواجہ حافظ کو ضبط تحریر میں لانے اور شائع کرنے میں میں نے حتی المقدور اپنے بزرگوار استاد صفا کے تئیں شاگردی کا حق ادا کیا ہے۔

نام کتاب	:	بزمِ حافظ شیرازی
مصنف	:	کاشی ناتھ پنڈت
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۶ء
صفحات	:	۲۶۰
تعداد	:	۱۱۰۰
زیرِ اہتمام	:	شیخ اعجاز احمد

پبلشر

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب

مدینہ چوک، گاؤ کدل، سرینگر کشمیر

تقسیم کار

ریزیڈنسی روڈ سرینگر، کشمیر

www.gulshanbooks.com

ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی ہو تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (پبلشر)

بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ
کہ زیارتگہ رندانِ جہان خواہد بود

خواجہ حافظ شیرازیؒ

پیش گفتار

ترتیب

تحریروں سے اہم اجزا اخذ کر کے مناسب مواقع پر پیش کیے جائیں تاکہ پڑھنے والے اِن قابلِ قدر تذکروں اور تاریخوں سے بہ یک وقت استفادہ کر سکیں جن تک اِن کی رسائی بے حد دشوار رہے۔

شاعروں اور ادیبوں کی زندگی اور اِن کے ماحول سے متعلق اطلاعات کی بسا اوقات کمیابی اور بعض اوقات نایابی ہر محقق کے لیے نا امیدی کا باعث رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مایوسی سے بچنے کے لیے قیاس اور گمان کی بھی مدد لینی پڑتی ہے، اور شاید یہ سلسلہ جدید فن تحقیق و تنقید کے باوجود جاری رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض موقعوں پر قیاس و گمان حقیقت سے زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان اور ادب کو صدیوں تک مقبولیت حاصل رہی۔ یہی نہیں ہندوستانیوں نے اس میں ایسے اضافے بھی کیے جو ایران کے دانش مندوں کی نظروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہندوستان میں فارسی ادب اور زبان کی تعلیم ایک کمی کا شکار رہی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی غیر ملکی شاعر یا ادیب کے فن کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے میں یہاں کا فارسی داں طبقہ قاصر رہا۔ وہ کمی یہ تھی کہ لوگ ایران کے ہزار ہا سالہ تاریخی اور تمدنی حالات سے بے خبر رہے۔ شاعر اور ادیب کو سمجھنے کے لیے اُس ملک کی تاریخ اور اس کے ماحول اور سماجی حالات کو پہلے جاننا لازمی ہے۔ زبان کے اصول اور قواعد کا ہی جاننا کافی نہیں۔ یہی غلط فہمی انگریزی ادب کے بارے میں بھی رہی ہے۔ اب بھی ہمارے یہاں ایسے لوگ ہیں جو زبان اور ادب کو ایک ہی چیز تصور کرتے ہیں اور زبان کو ادب کے ذریعے سیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے، اور اسی لیے تاریخ اور تمدن کی روشنی میں زبان اور ادب کا یا ایک بڑے شاعر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔

ایران کی تاریخ سات ہزار سال سے بھی زیادہ پُرانی ہے۔ انسانی تاریخ کے

حافظ شیرازی پر اس تحریر سے قبل بہت کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن کوئی تحریر کسی دوسری تحریر جیسی نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ نقل محض ہو۔ ہر حقیقی تصنیف اپنے مصنف کے زاویۂ نظر کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی انفرادیت بھی باقی رہ جاتی ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ اس زاویہء نظر کی وسعت کہاں تک ہے جو مصنف اپنی تصنیف کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔

دُنیائے ادب وفن میں کوئی بات حتمی یا حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ گلزار تحقیق و تصنیف کبھی ویران یا بے رنگ نہیں ہوا۔ ہر سنجیدہ لکھنے والے کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ لکھے وہ کہی ہوئی بات کا عین اعادہ نہ ہو۔ مگر بعض اوقات چند باتوں کا اعادہ لازمی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً تاریخی اور سوانحی پس منظر جو ہر صاحب فن کی نشو و نما میں چاہے وہ جذباتی ہو یا ذہنی، نہایت اہم رول ادا کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے صاحب الرائے حضرات کے اقوال کا ذکر ضروری ہوتا ہے جو شاعر یا ادیب سے متعلق خواص و عوام کے ردعمل کا تعین کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحب کتاب کی دونوں باتیں اہم ہو سکتی ہیں۔ چاہے وہ روایتی نقطہ نظر کے اتفاق میں ہوں یا اعتراض میں، مگر اس کی تحریر کی کامیابی محض اس کے اسلوبِ بیان پر ہی منحصر نہیں ہے بل کہ اس کے مواد کے ساتھ منصفانہ سلوک پر بھی ہے جو اس نے اپنے نقطہ نظر کی تقویت کے لیے جمع کیا ہو۔

موجودہ کتاب اِن ہی چند سوالات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس ترتیب میں اس امر کو ذہن میں رکھا گیا ہے کہ حافظ شیرازی پر قدیم اور جدید

انسانی تجربہ کے تنوع، عالم و جبر و قدر میں انسان کی انتھک تگ و دو اور زندگی کے رموز کی گہرائیوں تک جانے والے حافظ نے حقیقت اور مجاز کا اپنے اشعار میں نہایت دلاویز امتزاج پیدا کیا ہے۔

ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے دور میں فارسی ادب کو خاطر خواہ فروغ ملا اور بڑے نامور شاعر نثر نویس اور تاریخ نویس معرض وجود میں آئے جنھوں نے فارسی ادب کی دُنیا میں شہرت حاصل کی۔ لیکن اس کی ایک خامی یہ رہی کہ ہندوستانی مکتبوں، مدرسوں اور اعلا تعلیمی اداروں میں فارسی زبان اور ادب تو نصاب میں شامل ہو چکے تھے پر ایران کی تاریخ کی طرف چنداں توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ایران تاریخ وتمدن کے لحاظ سے دُنیا کا ایک عظیم ملک ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں اُس کا رول سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ ایران عرصہ دراز تک مقتدر امپراطوری کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ اس ملک میں شاھنشاہیت صدیوں تک اپنی پوری شان و شوکت سے برقرار رہی ہے۔ ایرانی قوم عظیم ثقافتی ورثہ کی مالک ہے اور بجا طور اُس پر فخر کرتی ہے۔ دین زردشت ایران میں دو ہزار سال تک برقرار رہا جس کی ابیاری مقتدر شاہی خاندانوں اور علم و ہنر کے مربّی گھرانوں نے کی۔ اسلام کے آنے کے بعد ایران نے اسلامی تاریخ وتمدن کو بارونق بنانے میں بے مثال رول ادا کیا۔ یہاں تک کہ اُن کی توسیع میں ایرانی عالموں اور فاضلوں نے عربوں پر سبقت حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ باکمال ایرانی مفکروں اور دانشوروں کی تخلیقات میں اس عظیم تمدنی، تہذیبی اور علمی ورثہ کی جابجا عکاسی ہوتی ہے۔ ایران کے ہر بڑے شاعر اور مفکر کے ہاں یہ عنصر رواں دواں ہے۔

خواجہ حافظ کا زمانہ ایران کی تاریخ کا پُر آشوب زمانہ تھا۔ تاتاریوں کی ترک تازیوں نے شیراز، یزد، کرمان اور اصفہان جیسے تاریخی شہروں میں آفت بپا کی اور اِن ادبی اور علمی مرکزوں کو میدان کارزار میں بدل دیا۔ اِن واقعات کو جب ہم دیوان

ارتقا میں اس ملک کا نہایت اہم مقام رہا ہے۔ حافظ، سعدیؔ، فردوسیؔ اور خیامؔ جیسے عظیم شاعروں یا ادیبوں کا مطالعہ ایک فرد کا مطالعہ نہیں بل کہ انسانی تاریخ کے ایک باب کا مطالعہ ہے۔ اس لیے فرد کو زمانہ سے الگ کر کے پرکھنے کا جو اصول ہمارے یہاں رائج تھا وہ اب ختم ہو رہا ہے۔ اور ماضی کے خسارہ کی تلافی کا وقت ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا۔ جو رُکے گا کھو جائے گا۔ جدید میکانکی چھاپے خانے اور رسل و رسائل، حمل و نقل اور مواصلات کے برقی ذرائع سب ہماری خدمت کے لیے کمربستہ ہیں۔ ایرانیوں نے گذشتہ صدی میں اِن سولیات کا بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ مادی پیشرفت کے ساتھ اُنھوں نے اپنے علمی اور ادبی خزانوں کو بازیاب کرنے اور اہم ادبی شخصیتوں کو موثر طریقہ پر روشناس کرانے میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعرانہ عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کی شاعری اور اُن کے زمانے کی تاریخ پر ایران کے بڑے عالموں اور فاضلوں نے قلم فرسائی کی ہے اور ان سے متعلق شاید ہی کوئی پہلو ہوگا جس پر رائے کا اظہار نہ ہوا ہو۔

ہندوستان میں بھی حافظ شیرازی فارسی ادب سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں نہایت ہی مقبول رہے ہیں۔ اُن کے بے شمار شعر زبان زدِ عام ہو چکے ہیں۔ دیوانِ حافظ سے فال گیری کا رواج ہر دور میں اور ہر طبقہ کے علم دوست لوگوں کا مشغلہ رہا ہے۔ ایران کے متعدد بادشاہوں، وزیروں، اور برجستہ ہستیوں کے بارے میں داستانیں دردست ہیں کہ مشکل وقت کے دوران اُنھوں نے دیوان حافظ سے استخارہ کیا تھا۔

کلام کی تازگی، زبان کی شیرینی اور محاورے کی چستی کے ساتھ گہرے انسانی تجربہ اور جذبہ کی بنا پر خواجہ حافظ کو لسان الغیب کا لقب عطا ہوا ہے۔ حافظ نے اپنے کلام کو قند پارسی بتایا ہے۔

پہلا باب

حافظ کی غزلوں اور اشعار میں تلاش کرتے ہیں تو ہمیں اس عظیم شاعر کی ذہن رسا کی بے شمار تہیں یکے بعد دیگرے کھل کر سامنے آتی ہیں۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے خواجہ حافظ کی شاعری کو اُس کے اپنے زمانے کی تاریخ کچھ اہم واقعات اور ایران کی عمومی تاریخ کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ خاص کر ہماری تحقیق شیراز کے تاریخی اور افسانوی شہر کے اردگرد گھومتی ہے جو خواجہ حافظ کی زندگی اور اس دور کے سماج سے مربوط ہے۔

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک تہران یونی ورسٹی میں کسب علم کے دوران مجھے کئی کتاب خانوں میں جا کر کچھ ایسے نادر قلمی نسخوں کو دیکھنے کا موقع ملا جو حافظ شیرازی کے متعلق کچھ نہ کچھ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ میں نے اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر اِن سے ضروری اور مربوط یادداشتیں محفوظ کر لیں۔ اس کے علاوہ تہران یونی ورسٹی کے شفیق استادوں کے درسوں میں بھی حافظؔ اور اس کی شاعری پر جو کچھ معلومات میسّر ہوئیں انھیں قلمبند کر لیا۔ واپسی کے بعد آج تک جو وقفہ گزرا ہے۔ وہ بھی اس کتاب کے مندرجات کی ترتیب و تذہیب کے لیے کارآمد رہاؔ۔ کیوں کہ حاصل شدہ مواد کے بعد ایران میں چھپنے والے کئی ادبی مجلوں میں حافظ پر بصیرت افروز مضامین شائع ہوئے جن سے استفادہ کیا گیا۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں کشمیر یونی ورسٹی کے شعبہ انگریزی کے سابق لکچرار جناب محمد آفاق صدیقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے مسودہ کے اوراق کو غور سے پڑھنے کی طویل زحمت اُٹھائی اور مجھے قیمتی مشورں سے نوازا۔ اُن کے علاوہ میں ایران اور ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں کے متصدّیوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

کاشی ناتھ پنڈت

یک شکل وربع شکل نقرہ معادل نصف مزد کاریگرانیکہ باکور
اداکہ عنوان سرکاری صدنفرراور ''ثی رازی ایش'' داردکار
ایشاں است''

البتہ کلمہ ''ثی رازی ایش'' کے معنی ابھی تک معلوم نہ ہوسکے۔ تہران یونی ورسٹی میں پہلوی کے استاد ڈاکٹر صادق کیا نے مجھے بتایا کہ اِن الواح پر ایسے کئی کلمات ہیں جن کے معانی ابھی تک سمجھ میں نہیں آتے۔

شیراز کے مشرق میں قصرابونصر کے مقام پر ایک امریکی وفد نے کچھ ایسی چیزیں پائی ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیراز کا شہر ھخامنشی خاندان کے بادشاہوں کے عہد میں اپنی پوری عظمت سے آباد تھا، قصر ابونصر میں کھدائی کا کام میٹروپولٹین میوزیم شکاگو کے کارشناسوں کے ذریعہ انجام دیا گیا، جن میں ڈاکٹر اوپن (Upen) کی تحقیقات بڑی قابلِ قدر ہیں۔ اس تحقیقاتی جماعت نے اپنی کاوش کے دوران کچھ ایسے مسکوکات اور دیگر اشیا دستیاب کی ہیں جو سلوکی، اشکانی اور دیگر قدیم تاریخی ادوار سے مربوط ہیں اور جن سے شیراز کی اہمیت اور شہرت کا کچھ پتا چلتا ہے۔ اِن میں کچھ سکے ایسے ہیں جن پر اردشیر خردہ (اردشیر خرہ) کے ساتھ شیراز کی شبیہ کا نام آیا ہے۔

یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی ہے کہ قدیم تاریخ کے کس دور میں شیراز فارس کا پایہ تخت رہا، لیکن جن مسکوکات، کھنڈرات اور کھدائی سے دستیاب شدہ چیزوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیراز کی تاریخ سات ہزار سال پرانی ہوسکتی ہے اور بقول استاد سعید نفیسی (درمکتب استاد) شوش، پازارگا اور تخت جمشید کی تاریخی قدامت سے کسی طرح کم نہیں۔

البتہ کلمہ شیراز کے ریشہ اور ماہیت کے بارے میں اور بھی کئی رائیں ہیں۔ مثلاً بارتھالڈ (Barthold) نے استخر کی تفصیلات درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

شیراز

ایران پر عربوں کے حملے کے بعد شیراز کے جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں تو ہمارے پاس اطلاعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے، لیکن لفظ شیراز کی اصل اور اس کی مختلف صورتوں کی واقفیت کے لیے ہمیں اسلامی دور سے پہلے کے مآخذوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ مآخذ یا تو کافی نہیں یا بہت سارے ہماری دانست اور دسترس سے باہر ہیں۔ شیراز سے کچھ دُوری پر ھخا منشیوں کا قدیم اور عظیم پائے تخت ''تخت جمشید'' ہے، جسے یونانی مورخ ہروڈوٹس Herodotos نے پرسی پولس (Persepolis) کا نام دیا ہے۔ یہاں کے کھنڈرات میں کھدائی اور تحقیق کے دوران مٹی کی کچھ تختیاں ہاتھ لگی ہیں جو قدیم شاہنشاہوں نے اپنے خزانوں یا دفتر خانوں میں محفوظ کروائی تھیں۔ اِن تختیوں پر ایلامی زبان میں کچھ عبارت درج ہے، جسے گذشتہ برسوں میں پڑھنے اور ثبت شدہ نقوش کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ قابلِ قدر خدمات امریکہ میں شکاگو یونی ورسٹی کے پروفیسر کیمرون نے انجام دی ہیں۔ اُن میں ایک تختی ھخامنشی خاندان کے پادشاہ داریوش سے متعلق ہے۔ جو ۴۶۶ ق م کی بتلائی جاتی ہے۔ اس تختی پر ایک لفظ ''ثی رازی ایش'' کی صورت میں درج ہوا ہے۔ چناں چہ محققوں کے نزدیک لفظ شیراز کی قدیم ترین صورت یہی ہے، اور علم اللغہ کے اصولوں کے مطابق اس کا شیراز میں تبدیل ہونا ممکن ہے، مٹی کی مذکورہ بالا تختی بظاہر اُن مزدوروں کی اُجرتوں کا حساب کتاب ظاہر کرتی ہے۔ جو خشایارشا کی طرف سے شیراز میں کسی تعمیری کام کے سلسلہ میں دی گئی تھیں تختی پر ثبت متن کا ٹوٹا پھوٹا فارسی ترجمہ یوں ہوسکتا ہے۔

''ارتخما بہ ہوش خزانہ دار پارس گذارش مید ہد ۳۷ کارشاد

میں ھروڈوٹس (Herodotus) بھی شامل ہے۔ ''پرسس (Presis) کی شکل میں استعمال کیا ہے۔ مغربی اساطیر میں پارس کو جوپیٹر کا بیٹا بتایا گیا جو مینروا (Minerva) اور مرکوری (Mercury) کی رہنمائی سے محیر العقول کام کرتا تھا۔ اس کی شادی'' ڈاینا (Diana) کے ساتھ ہوئی جس کا نتیجہ ایک لڑکا ہوا، اور اس کا نام ''پرسس'' رکھا گیا۔ یونانی اسی ''پرسس'' کو ''پارس'' قوم کا بانی خیال کرتے ہیں۔

شیراز کے نواحی تقریباً ایک مستطیل شکل بناتے ہیں جس کے اضلاع اُبھرے ہوئے ہوں۔ شیراز تین طرف پھیلے ہوئے پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان میں واقع ہے۔ مغرب اور جنوب مغرب میں کوہ دراک اور شمال مشرق سے لے کر جنوب مغرب تک کوہ بمو پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی سمٹی ہوئی ڈھلوان کو شیرازی ''جُلگاہ'' یا ''جلگہ'' کہتے ہیں۔ جو ۶۹. ۳۸ درجہ عرض بلد اور ۵۲. ۴۰ درجہ طول بلد کے درمیان واقع ہے اس کا طول ۱۲۰ کلومیٹر اور عرض ۱۲ کلومیٹر ہے۔ کل رقبہ ۱۲۴۴ مربع کلومیٹر ہے اور سطح سمندر سے تقریباً ۱۸۸۵ کلومیٹر کی بلندی پر واقع ہے عام طور پر جُلگہ شیراز کے شمالی پہاڑ سے چشمے ابلتے ہیں۔ جن کا پانی جنوب کی طرف بہ کرندی کی صورت اختیار کرتا ہے۔

آب وہوا

جُلگہ شیراز کے جنوبی نقطہ سے خلیج فارس زیادہ سے زیادہ ۲۸۰ کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ شیراز کا میدان دراصل گرم سیر اور سردسیر دو متضاد منطقوں میں واقع ہے۔ اس لحاظ سے یہاں کی آب وہوا سردیوں میں نہ سخت سرد ہے اور نہ گرمیوں میں سخت گرم۔ کم سے کم درجہ حرارت منفی ۳ اور زیادہ سے زیادہ ۳۸ درجہ سنٹی گریڈ ہے شیراز میں سب سے بڑا دن اور سب سے بڑی رات بیس گھنٹہ اور چھ منٹ کے ہوتے ہیں۔ بارش اکثر سردیوں میں مارچ اور اپریل کے مہینوں

یہ لفظ شیر + از سے بنا ہے جس کے معنی شیر کے شکم ہیں۔ اس کے لیے عربی میں ''جوف الاسد'' کی ترتیب لائی گئی ہے۔ بارتھالڈ کا کہنا ہے چوں کہ گرد و نواح سے وادر ہونے والی کھانے پینے کی تمام اشیا شہر کی بڑی آبادی فوراً مصرف میں لاتی تھی، اس لیے اس کا نام ''شکم شیر'' پڑا۔ بارتھالڈ کی اس اطلاع کا مآخذ مجمل التواریخ ہے، جو ملک الشعرا بہار کی تصحیح کے ساتھ تہران میں چھپی ہے۔ ایک اور قیاس یہ ہے کہ شیر + آز بمعنی بیشۂ شیر ہے چوں کہ آب و ہوا کے لحاظ سے شیراز معتدل اور خوشگوار ہے اور جنگلات اور روئیدگی بکثرت ہے اسی وجہ سے اس کا نام شیراز پڑ گیا۔

مجلّہ یغما کے شمارہ ۳ مورخہ ۱۲ خرداد ۱۳۳۸ میں جمشید سردشیان نے ''اشتقاق نامہای برخی از شہرھای ایران'' کے تحت ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ شیراز دراصل ''شہرراز' تھا اس کا قول ہے کہ شہر پہلوی زبان کے کلمہ ''شتھر'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنی شہر کے ہیں اور اوستا کا کلمہ ''رازا'' پہلوی زبان میں ''راز'' بن جاتا ہے۔ اس لیے شیراز کے معنی ''شہرراز'' کے ہیں اس کی توضیح دیتے ہوئے صاحبِ موصوف نے لکھا ہے۔

> ''چوں کہ قدیم زمانے میں یہاں اہم سرکاری
> کاغذات اور دستاویزات محفوظ کیے جاتے تھے اور
> کتب خانے بھی دابر تھے اس لیے اس کا نام شہرراز
> اور بعد میں شیراز پڑا''

سعدی کا یہ شعر اس لحاظ سے پُر معنی ہے

نہ لایق ظلماتست باللہ این اقلیم　　　　کہ تختگاہ سلیمان بدست وحضرت راز

شیراز کا جغرافیہ

شیراز ایران کے صوبہ فارس کا مرکز ہے، فارس کلمہ ''پارس'' کا معرب ہے اور اوستا میں ''پارتو'' کی صورت میں آیا ہے۔ اصل کلمہ یونانی مورخوں نے جن

شاداب کھیت اور پہاڑ اس شہر کو عجیب خوب صورتی اور رعنائی، عطا کرتے ہیں۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ مناظر فطرت کی جلوہ گری غارت گر دین وایمان بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ نوروز کے دنوں میں ایران کے مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ شیراز آکر یہاں کی سرسبز وشاداب فضا سے لطف اُٹھاتے ہیں یہ رسم قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ چناں چہ شیخ سعدی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

خوشا تفرّج نوروز خاصہ در شیراز کہ برکند دل مسافر از وطنش

سعدی اور حافظ دونوں نے بارہا شیراز کی آب وہوا کی خوبی، صاف و شفاف پانی، اور وہاں کے لوگوں کی فراخ دلی کا ذکر کیا ہے۔

حاجی میرزا احسن فسائی کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں قدرتی حُسن کی تعریف کی گئی ہے۔

فارس را شیراز چوں شیرازہ است وصف او بی حد و بی اندازہ است
در تموزش دمبدم باد شمال میود زگرما شود زو پائمال
در زمستانش سراسر چوں بہار یخ نبند جز بروزی یا چہار
نیست کس گریاں مگر ابر بہار در کسی افغان کند باشد ہزار
گر بجوشد کس بود خم شراب در خروشد کس بود چنگ و رباب

شیراز کے القاب اور عنوانات

اسلامی دور سے قبل مختلف ذرائع سے ہاتھ آنے والے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ شیراز کا قدیم نام ''تی رازی ایش'' ضبط ہو چکا ہے۔ تسلط اسلام کے بعد مختلف ادوار کی مقامی حکومتوں، شاعروں، تاریخ نویسوں اور سیاحوں کے ذریعہ شیراز کوئی

میں ہوتی ہے۔ البتہ جنوب مغرب یعنی قلات اور خلار جیسے اگلے علاقوں میں کافی سردی ہوتی ہے اور شدید برفباری بھی ہوتی ہے۔

شیراز میں کبھی تو شمال سے ہوائیں چلتی ہیں جنھیں بادشمال کہتے ہیں اور کبھی جنوب مغرب سے جنھیں بادِ جنوبی کہتے۔ بادشمال کو دل پسند اور روح پرور خیال کیا جاتا ہے۔ حافظ نے کئی بار بادشمال کا ذکر اسی جذبہ کے تحت کیا ہے۔

هر صبح و شام قافلہ ای از دعای خیر　　　در صحبت شمال و صبا می فرستمت

بجز صبا د شما لم نمی شنا سد کس　　　عزیز من کہ بجز باد نیست دمسازم

خواجوی کرمانی نے اسی بادشمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

ہر نسیمی کہ از آں خط بیاید باد است

خُنک آن باد کہ از جانب شیراز آید

چوں کہ شیراز سرد اور گرم منطقوں کے درمیان واقع ہے اس لیے آب و ہوا کے لحاظ سے وہ تقریباً تمام قدرتی مناظر سے سرشار ہے جو اِن دونوں منطقوں میں متصور ہیں۔ اس لیے شیراز میں سرد علاقوں میں اُگنے والے درخت اور پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور گرم علاقوں میں اُگنے والے بھی۔ ہوا کی ملائمت اور موسم کے اعتدال کی وجہ سے شیراز میں انواع واقسام کے پھول ہر فصل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیراز گویا ایک گل خانہ ہے جس میں ہر وقت رنگارنگ پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

علاوہ ازین ایک اور خوبی یہ ہے کہ صرف موسم بہار میں نظر آنے والے پرندے یہاں سال بھر باغوں میں چہچہاتے رہتے ہیں۔ اسی بناپر شیراز کو شہر گل و بلبل کہا جاتا ہے۔ ہوا کی لطافت، آسمان کی صفائی، اُفق کی کشادگی سرسبز اور

یہ امر مسلم ہے کہ شیراز علما و عرفا کا شہر تھا۔ منگولوں کی تباہ کاری کے بعد خراسان اور دیگر مقامات سے سرکردہ عالم اور فاضل شیراز کی طرف چلے آئے۔ یہاں کئی بڑے مدرسے اور کتاب خانے تھے۔ فرصتؔ نے اپنی کتاب سندالابرار میں لکھا ہے کہ

''......خالی نیست شیراز ہرگز و ہیچ ساعت از چہار صد
وچہل و چہار ولی کہ در پس تراز و ہستند و اجناس می
سنجند ......''

شیراز کے خدادوست، راستباز اور نیک نام اہل بازارِ وکسبہ کی طرف اشارہ ہے، چناں چہ سعدیؔ نے بھی اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہزار پیر و ولی باشد اندروی   کہ کعبہ برسر الیشان ہمی کند پرواز

ساتویں صدی ہجری سے کچھ پہلے شیراز کو ایک اور لقب سے یاد کیا جانے لگا، اور وہ ہے ''ملک سلیمان'' تاریخ وصاف اور شیراز نامہ تقریباً اسی دور کی کتابیں ہیں۔ ان کی عبارت میں یا نقل قول کے وقت بار ہا'' ملک سلیمان'' اور ''تخت سلیمان'' کو'' دارالملک شیراز'' کا مترادف لایا گیا ہے۔ اگرچہ دارالملک شیراز بھی استعمال ہوا ہے۔ صاحب شیراز نامہ نے ملک اشرف کی شیراز سے ہزیمت اور جلال الدین مسعود کے زوال میں یہ اشعار کہے؛

سپاس وشکر خدارا کہ میر فرخ بخت   خدیو مملکت آراشہہ غریب نواز
بسال ہفت صد و چہل باسہہ در تحمل و ناز   بہ تخت گاہ سلیمان رسید دیگر باز

سعدیؔ نے اپنے اشعار میں کئی بار شیراز کو ملک سلیمان اور تخت سلیمان کے عنوانوں سے یاد کیا ہے۔

القاب یا عنوانات سے یاد کیا گیا ہے۔ اِن سب کا کما بیش ذکر بے جا نہ ہوگا۔

قدیم ترین عنوان جس سے شیراز کو یاد کیا گیا ہے۔ ''دار الملک'' ہے چناں چہ ابن بلخی نے فارس نامہ کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

''...... چون مقتضی برائ اعلا سلطان شاہنشاہی لازوال
من العمر چناں بود کہ پارس طرفی بزرگ است
مما لک محروسہ...... د ہموارہ دارالملک و برگاہ ملوک پارس
بودہ است۔''

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور سے پہلے فارس، ایران کے قدیم بادشاہوں کا اصلی مرکز تھا، اسلامی عہد میں چوں کہ شیراز صوبہ فارس کا مرکز رہا ہے، اس لیے اُسے ''دار الملک'' کا عنوان دیا جانے لگا اور یہ رسم صفوی عہد تک بدستور جاری رہی۔[1]

شیراز نامہ میں بار بار کلمہ دارالملک کو شیراز سے پہلے لایا گیا ہے۔ مثلاً اتابک آبش خاتون، جو اتابک سعد بن ابی بکر اور تُرکان خاتون کی بیٹی اتابکان سلفر (سعدی کے ممدحین) کی آخری فرمانروا تھی، کے زمانے میں سید شرف الدین کی شیراز پر چڑھائی سے متعلق یہ عبارت درج ہے۔

''...... بالشکری آراستہ بغرم استخلاص دارالملک شیراز،
از حدود شبانکارہ درحرکت آمد......۔''

شاہ عباس دوم صفوی کے زمانے میں ایک فرماں کے تحت ''دار الملک'' کے عنوان کو ''دار العلم'' میں تبدیل کیا گیا۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صفویوں نے اپنا دار الخلافہ رسمی طور پر اصفہان مقرر کیا، اور شیراز صرف ایک علمی مرکز کی حیثیت سے باقی رہا، لیکن اس تبدیلی کے باوجود شیراز کی علمی، تمدنی اور تہذیبی شہرت میں نہ صرف کوئی کمی نہیں آئی بل کہ اُس میں اضافہ ہوا۔

---

[1] شیراز نامہ، تالیف ابوالعباس ابی الخیر (زرکوب، چاپ تہران۔ ۱۳۱۰ھ

اس طرح کی عبارت اور بھی کئی مورخوں کی نگارشات میں دیکھی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیراز یا اس کے آس پاس کوئی ایسی یادگار تھی کہ جس کو سلیمان کا عبادت خانہ جیسے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے ملک سلیمان اور تخت سلیمان کے عنوان شیراز کے لیے تراشے گئے۔

فرانسیسی سیاح ٹاورنہ (Tavernier) نے ۱۶۶۵ میں شیراز کی سیاحت کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ شیراز کے جنوب مشرق میں شہر سے کچھ دوری پر ایک ٹیلہ پر تین عمارتوں کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عبادت گاہوں کے کھنڈرات ہیں جہاں قدیم زمانے میں ایرانی پرستش کیا کرتے تھے۔ سال ۱۶۷۴ء میں ایک اور فرانسیسی سیاح نے شیراز کی سیاحت کے دوران لکھا ہے کہ

> ''شہر سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ایک بُرج ہے جس کی گولائی ۳۸ سے لے کر ۴۰ ہاتھ تک ہے۔ اس کے دروازے شمال، مشرق اور جنوب کی طرف کھلتے ہیں۔ اس کا مصالحہ سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے اور اس قدر مضبوط ہے کہ بہت وقت گزرنے کے باوجود اس میں رخنہ نہیں پڑا ہے ایرانی اس کو مادرِ سلیمان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''

اس عمارت کی ساخت اور سیاحوں کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مادرِ سلیمان دراصل کوئی بڑا آتش کدہ تھا جو اسلامی دور میں ٹھنڈا ہوا، لیکن اس کے مکمل انہدام کو روکنے کے لیے ایرانیوں نے اُسے مادرِ سلیمان کے نام سے مشہور کیا۔ چوں کہ حضرت سلیمان پیغمبر کا ذکر قرآن میں آیا ہے اس لیے ممکن ہے ایرانیوں نے عربوں کو اس آتش کدہ یا اس عمارت کے انہدام سے باز رکھنے کی ایک زیرکانہ تدبیر نکالی ہو۔

نہ لائق ظلماتست باللہ این اقلیم   کہ تخت گاہ سلیمان بدست وحضرت راز

حافظؔ نے بھی اسی لقب کو کئی بار استعمال کیا ہے۔

بادت بدست باشد اگر دل نہی بہ ہیچ   در معرضی کہ تخت سلیمان رود بباد

....

دلم از وحشت زندان سکندر[1] بگرفت   رخت بر نبدم وتا ملک سلیمان بردم

....

نقش خوارزم وخیال جیحون می بست   باہزاراں گلہ از ملک سلیمان میرفت

....

بخواہ جام صبوحی بیادِ آصف جاہ   وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود

شاہ شجاع کی مدح میں قصیدہ میں بھی حافظؔ نے ایکبار ''ملک سلیمان'' کی ترکیب استعمال کی ہے

بعد از کیان بملک سلیمان نداوکس   این ساز واین خزینہ واین لشکر گران

ملک سلیمان یا تخت سلیمان کا لقب شیراز کو کیوں دیا گیا یہ بھی بڑی دل چسپ بحث ہے۔ شیراز نامہ میں یہ عبارت درج ہے۔

''..........ملوک عجم وشہر یاران ایران زمین ہر سال یک نوبت درین نقطہ زمین آمدندی گفتندی کہ صومعہ سلیمان درین زمین بودہ است۔''

---

[1] تاریخ جدید یزد (احمد بن حسینبن علی الکاتب) میں شہر یزد کے بارے میں لکھا ہے

''..........وکت راز ندان ذوالقرنین خواندہ اند چناں چہ مولانائے اعظم شمس الدین محمد الحافظ الشیر ازی موگوید

دلم از وحشت زندانِ سکندر بگرفت   رخت بر بندم وملک سلیمان بردم

مثلاً شیراز جنت طراز، شہر گل و بلبل، شہر عشق، شہر ہز خیز، شہر زندہ دلان وغیرہ

تاریخی مقامات:۔

شیراز میں اسلامی دور سے قبل اور بعد دونوں زمانوں کے نادر تاریخی مقامات عمارت اور کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ اِن سب کا تفصیلی ذکر تو یہاں ممکن نہیں، البتہ ہم چند ایسی جگہوں کا ذکر کریں گے جو حافظ کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی علمی اور ادبی حیثیت اور اہمیت کے حامل رہے ہیں اور کسی نہ کسی طرح حافظ کے مطالعہ کے دوران ہماری نظروں سے گزرتے ہیں۔

مسجد جامع عتیق:۔

شیراز میں اسلامی دور کے قدیم ترین آثار میں مسجد جامع عتیق کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہیے۔ سال ۲۸۱ھ میں عمرو لیث صفاری کے حکم سے اس مسجد کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ چناں چہ ملک الشعرا بہار نے ۱۳۱۲ھ ش میں شیراز کے سفر کے سلسلہ میں ایک قصیدہ ''شیراز'' کے عنوان سے لکھا تھا جس میں مسجد جامع اور عمرو لیث کی طرف اشارہ ہے۔

بر مسجد ویران عمرو لیث ... رُخ سای کہ پیریست بافرین
رُخ سای برآن فرخ آستان ... بزدای از وگرد باستین
قرآن کدہ اش را دوران صحن ... با دیدۂ قرآن شناس بین

یہ مسجد کئی بار حوادث روزگار کے ہاتھوں ویران ہوئی اور از سرِ نو زیرِ تعمیر لائی گئی۔ اس کے صحن کے وسط میں مکعب شکل کی ایک عمارت ہے جس کو ''خانہ خدای'' یا ''بیت المصحف'' کا نام دیا گیا ہے۔ شدالازار'' کے مولف کا قول ہے کہ بیت المصحف'' میں قرآن کے کئی نسخے اور جزوات ہیں۔ جنھیں اہل بیت، صحابہ یا تابعین

ٹادزینہ کا قول ہے کہ اس عمارت کے پتھروں پر ایسی کندہ کی گئی صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں جن میں ایک انسان ہاتھ میں آگ کے شعلے لیے جارہا ہے۔

پروفیسر براون نے شیراز کو ''شہر سبز سلیمان'' کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کھنڈرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مصنف کو بھی سال ۱۹۶۲ء میں ان نواحی کی سیاحت اور ان کھنڈرات کو دیکھنے کا موقع ملا۔

غزلیات حافظ کے مشہور تر کی شارح ملا سودی نے بھی حافظ کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ شیراز سلیمان پیغمبر کا پایہ تخت تھا۔

بخواہ جام لبالب بیاد آصف دہر وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود[1]

اس عنوان کے علاوہ شیراز کو اور بھی کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ قبۃ الاسلام۔

ہر آن کس کہ کند قصد قبۃ الاسلام بریدہ باد سرش ہمچو زر و نقرہ بگار (سعدی)

۲۔ دار الفضل

''حسب الامر پدر والا گہرش از دار الفضل شیراز محرک لشکر ظفر از گردید''

تاریخ گیتی گشا، عطا ملک جوینی

۳۔ شہر نیک مردان

کہ گوش دار تو این شہر نیک مردان را ز دست ظالم بد دین و کافر غماز

(سعدی)

۴۔ خال رُخ ہفت کشور۔

شیراز و آب رُکنا و گلگشت خوش نسیم
عیبش مکن کہ خال رُخ ہفت کشور است

(حافظ)

شاعروں اور منشیوں نے شیراز کو کئی اور لقبوں اور عنوانوں سے یاد کیا ہے۔

تنگ اللہ اکبر:۔

تنگ فارسی میں درّہ کو کہتے ہیں ۔ تنگ اللہ اکبر کو شیراز کے شمال میں کوہِ سبوی اور چہل مقام کے درمیان اصفہان اور یزد سے آتے ہوئے شیراز کا دروازہ سمجھ لیجیے۔

رکنا باد کی ندی درّہ کے وسط سے گزرتی ہے ۔ جس کی بدولت درّہ کے دائیں بائیں دور تک سبزہ زار پھیلا ہوا ہے ۔ تنگ اللہ اکبر پر پہنچ کر سامنے کی ڈھلوانوں اور پہاڑوں کے دامن میں شیراز کا افسانوی اور سحر انگیز شہر دکھائی دیتا ہے ۔ اس جگہ کا قدرتی نظارہ ، ہوا کی طروات اور اطراف کی شادابی مسافر کی طبیعت سے خستگی اور کسالت کے آثار مٹا دیتے ہیں چناں چہ سعدی کہتا ہے۔

چہ خوش سپیدہ دم باشد آنکہ بینم باز
رسیدہ بر سرِ اللہ اکبر شیراز

تنگ اللہ اکبر ، رکنا باد ، اور مصلیٰ حافظ کے اِن دو اشعار کی وجہ سے لافانی اور زبان زدِ عام ہو چکے ہیں۔

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

فرق ست ز آب خضر کہ ظلمات جای اوست
با آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

تنگ اللہ اکبر کی خوب صورتی اور تسمیہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب A year Among Persians میں لکھا ہے:

جونہی میں اصفہان ، شیراز کی شاہراہ کے ایک زاویہ
سے گزرا اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا

نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے، اِن میں ایک نسخہ حضرت علیؓ کے خط شریف میں ہے۔ اس کے علاوہ امیر المومنین حسن علی بن الحسین زین العابدین اور امام جعفر صادق کے لکھے گئے نسخہ جات بھی شامل ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ فتنہ ایام میں نایاب ہوا۔

(شیراز، تالیف حسن امداد چاپ تہران ص ۱۳۴)

ڈاکٹر قاسم غنی نے تاریخ عصر حافظ جلد اوّل ص ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ

"۷۷۷ھ میں خواجہ جلال الدین تورانشاہ نے قرآن کا ایک نسخہ مسجد عتیق شیراز کو وقف کیا، جسے یحیٰ الجمالی نے ۷۴۵۔۴۶ھ میں نہایت نفیس خط ثلث میں لکھا تھا۔ اس وقت اس کے چوبیس جزوات بارہ مجلد میں شیراز کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔"

بیت المصحف کو حافظ کے ممدوح شاہ شیخ ابواسحاق انیجو نے بنوایا تھا اور شیرازؔ کے کئی نامور علمائے دین اسی تاریخی مسجد کے منبر سے وعظ اور خطابہ ایراد کر چکے ہیں۔

اُن میں شیخ روزبہانؔ اور عبداللہ خفیف جیسے عالم بھی شامل ہیں۔ جن کا ذکر سعدیؔ نے ایک قصیدہ کے دوران ان کی پارسائی اور دینداری کے لحاظ سے کیا ہے۔

بذکر وفکر عبادت بُروح شیخ کبیر
بحق روزبہان بہ حق پنج نماز

شیخ کبیر سے مراد عبداللہ خفیف ہے، اسی قدیم مسجد کے زیرسایہ قبرستان ہے جس میں شیراز اور ایران کی کئی مشہور ہستیاں دفن ہو چکی ہیں۔ اِن میں وصال شیرازی اور اُن کے چاروں بیٹے شامل ہیں۔

خبر رسانی کے لیے ایک پاس گاہ تھی۔ گہوارہ یہ قدیم طرز کے طاقوں والا بُرج ہے جس کو گہوارہ دیو اور گنبد عضد کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے بعض محققوں کا خیال ہے کہ یہ گنبد آگ، اور دھویں کے ذریعہ خبر رسائی کی غرض سے اسلامی دور سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے چار طاق، چار سمتوں میں کھلتے تھے۔، اور جس طرف خبر پہچانی مطلوب ہوتی تھی اُس طرف کا پردہ اوپر نیچے اُٹھا کر آگ کے شعلوں کی علامت سے خبر رسائی کا کام انجام دیا جاتا تھا۔ چوں کہ دن میں شعلوں کے ذریعہ خبر رسائی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے عمارت کی چھت میں ایک سوراخ کیا گیا تھا۔ جس کو ضرورت پڑنے پر آہنی تختہ سے بند کیا جا سکتا تھا اگر دن میں مخابرہ کی ضرورت پڑتی تو اس کو اُٹھا کر دھویں کو خارج کیا جاتا تھا۔ البتہ کئی محقق یہ کہتے ہیں کہ عضد الدولہ دیلمی نے اس گنبد کو اپنی فوج کے لیے پاسبانی کا ٹھکانا بنایا تھا اس لیے اس کو گنبد عضد الدولہ بھی کہتے ہیں۔ سعدیؔ نے بھی ایک حکایت میں اس گنبد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ وہی عضد الدولہ ہے جس کو تاریخ میں عضد الدولہ فنا خسرو کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، اور جس کے عہد میں یعنی ۲۸۲ ہجری میں مشہور عربی شاعر متنبی شیراز آیا تھا اور عضد الدولہ کی مدح میں ۱۴۹ اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔

رُکنا باد

تہران اور اصفہان سے شیراز کا راستہ تنگ اللہ اکبر سے گزر کر شیراز آ پہنچتا ہے رکن آباد کی ندی اس درہ کو سر سبز اور شاداب بناتی ہے۔ حافظ نے بار بار رکنا باد کا نام لیا ہے، اور اس کی تعریف کی ہے۔ رکن آباد کی قنات یعنی زمین دوز نہر کو رکن الدین دیلمی کے حکم سے ۳۳۸ ہجری میں کھدوایا گیا تھا، یہ جو یبار ساتوں صدی ہجری ہی سے بڑی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ چناں چہ سعدی نے بھی اپنی غزلوں میں کئی بار اس کا ذکر کیا ہے۔

منظر آیا جو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں عمر بھر اس
لیے نہیں فراموش کر سکتا کیوں کہ میں نے زندگی میں
اس سے پہلے کبھی ایسا پُر اثر منظر نہیں دکھا تھا۔ یعنی
شیراز اور اس کے اطراف وہ خاص نقطہ جو میری
آنکھوں کے سامنے تھا اور جس کو سب ایرانی اور حافظ
کے شناسا اچھی طرح جانتے ہیں۔ تنگ اللہ اکبر کہلاتا
ہے جس مسافر کی نظر اس جگہ سے دور شیراز کی گودی پر
پڑتی ہے وہ اس کی خوب صورتی سے اتنا متاثر ہو جاتا
ہے کہ فرط حیرت و تحسین سے بے اختیار ''اللہ اکبر''
پکارتا ہے۔

تنگ اللہ اکبر کے آس پاس کچھ تاریخی آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِن میں
گہوارہ دید اور چاہ مرتاض علی قبل از اسلام دور سے تعلق رکھتے ہیں اور دروازہ
قرآن، گنبد عضد (گہوارہ دید) آرامگاہِ خواجوی کرمانی، مشرقی، قنات رکناباد،
خرابہ خلعت پوشان اور آرامگاہِ عمادالدین محمود، بعد اسلام دور سے۔ اس مقام پر
قبل از اسلام دور کے اور بھی کئی آثار کی نشاندہی کی جاتی ہے جو اب نیست و نابود
ہو چکے ہیں۔ مرتاض علی اور گہوارِ دید تنگ اللہ اکبر کے بائیں طرف واقع ہیں کچھ
لوگوں کا خیال ہے کہ چاہ مرتاض اگلے وقتوں میں ایک اہم آتش کدہ کی جگہ تھی جسے
اسلامی دور میں ڈھایا گیا۔ عام شیرازیوں کا خیال ہے کہ اسی چاہ مرتاض علی کے
نزدیک حافظ پر ذیل کی غزل کا نزول ہوا تھا:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

گہوارہ دید کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اسلامی عہد میں نگہبانی اور

مصلیٰ شیراز کے شمال میں کوہ چہل مقام کی ڈھلوان میں ایک وسیع قطعہء زمین ہے جو قدیم زمانے میں قبرستان کے لیے وقف ہو چکا تھا چناں چہ حسن امداد کی تالیف ''شیراز در گزشتہ وحال'' کا یہ جملہ اس مقولہ کی تصدیق کرتا ہے:

''......در ہمین محل کہ امروز بنام قبر شاہ شجاع در قسمت
شمال گورستان مصلیٰ است مدفون گردید''

ساتویں صدی ہجری کا نامور عالم فخر الدین ابو عبداللہ معروف بہ ابن ابی مریم شیرازی بھی گورستان مصلیٰ میں دفن ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی کا ایک اور عالم قطب الدین محمد بھی اسی گورستان میں دفن ہو چکا ہے۔

مصلیٰ یا خاک مصلیٰ (بعض اوقات صحرای مصلیٰ) موجودہ دروازۂ اصفہان اور شاہ میر علی بن حمزہ کے بقعہ سے شروع ہو کر چہل مقام کے دامن تک پھیلا ہوا ہے کچھ سال پہلے علی بن حمزہ کے بقعہ، جو اس وقت ہنرستان کی جگہ ہے اور جس کے ساتھ اس وقت کا باغ ملّی اور وسیع اطراف ہیں، جن میں حافظیہ بھی شامل ہے، کے نزدیک جو اِن آباد سب قبرستان تھا اور اب بھی وہاں پر قبریں موجود ہیں۔ خاک مصلیٰ کے شمال میں خواجہ حافظ کی آرام گاہ قرار پائی ہے۔ لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مصلیٰ کے وسیع اطراف میں صرف قبرستان ہے اس کے شمال اور مغربی حصوں میں قبرستان نہیں تھے، بل کہ نہایت سرسبز اور شاداب ڈھلوان تھی جس میں رکنا باد کی ندی بہتی ہے۔ مصلیٰ کی اہمیت اس لیے ہے کہ خواجہ حافظ کی آرام گاہ اسی جگہ پر واقع ہے۔ اس کی تاریخ وفات خاک مصلیٰ کی ترکیب سے نکالی گئی ہے، اگر چہ اس میں تردید کی گنجائش باقی ہے۔

استاد علی اصغر حکمت نے اپنی تالیف ''از سعدیؔ تا جامیؔ'' کے صفحہ ۲۷۸ کے حاشیہ پر خاک مصلیٰ کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے:۔

''...... خاک مصلیٰ دشت وسیع وصفا وطرب انگیزی

دست از دامنم نمی دارند
خاک شیراز و آب رکنا باد

پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ میں اس نہر کے سرچشمہ پر پہنچا جس کو حافظ نے جاویدان کردیا ہے۔

رکنا باد کا سرچشمہ شیراز کے شمال میں آدھ فرسنگ کے فاصلہ پر کوہ بمو میں ہے اور تنگ اللہ اکبر کے مدخل سے اس قنات کو دیکھا جا سکتا ہے، اکبر آباد نام کے گاؤں کو بھی یہی جو یبار سیراب کرتی ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں میں اس نہر کے پانی کی بڑی تعریفیں ملتی ہیں۔

فارس نامہ میں درج ہے کہ حکما اور اہل طب نے رکن آباد کے مجموعی صفات، اور اس کی خاصیتوں کے بارے میں چھ باتوں کا ذکر کیا ہے۔

ا۔ اس کا منبع دوری پر ہے (۲) ندی مکشوف راہوں سے گزرتی ہے (۳) اس کا پانی سنگریزوں اور پتھروں پر سے گرتا کرآتا ہے (۴) اس میں کسی قسم کے جراثیم یا حشرات موجود نہیں (۵) اس کے کنارے پر کوئی ایسا درخت نہیں جو پانی کے مزاج میں تبدیلی کا باعث بنے (۶) اس کا پانی اونچائی سے اُچھل کر نیچے گرتا ہے۔ ایسا پانی مزاج اور ہاضمہ کے لیے لطیف ہوتا ہے۔

(فارس نامہ ناصری تالیف حسین زرکوب)

مصلیٰ

مصلیٰ کو حافظ نے جاودانی بخشی، چناں چہ:

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

۱۳۲۰ھ ہجری شمسی میں خاک مصلیٰ میں رہائشی اور سرکاری عمارت کی تعمیر سے اس خوب صورت خطہ میں رونما ہوئی بے رونقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''افسوس یہ خوشنما جگہ جو کئی صدیوں سے ارباب ذوق اور رندان جہان کی زیارت گاہ رہی ہے اور ایران کے نزہت انگیز مناظر میں سے ہے اب فارس میں حاکم وقت کی لاتعلقی اور نادانی سے اور رئیس بلدیہ کی بے ذوقی سے ایک بدنما محلّہ میں تبدیل ہوئی ہے۔ بے انصاف لوگوں کی ایک جماعت نے قبرستان کی زمین پر ناہنجار قسم کی عمارتیں بنا کر اس دل کش منظر کو قبیح بنا دیا ہے اور اس زمانے کے لوگوں نے شیراز کو بے ادبی و فقدان لطف و ذوق میں شہرہ عام کر دیا ہے۔ سب سے بدتر یہ کہ سیلو نام کی ایک بدنما اور بدترکیب نہر کے بنانے سے ادب و صفا کی اس بزم گاہ کو اور بھی مکدر بنایا ہے۔ اب اس جگہ ایک بدزیب اور بدنما منظر وجود میں آیا ہے جو اِن کی بدذوقی کی صاف دلیل ہے۔ افسوس، ہزار ار افسوس!!

حافظیہ یا آرام گاہ حافظ

حافظؔ کو خاک مصلیٰ سے بڑی محبت تھی۔ چناں چہ وفات کے بعد اس کے جسد خاکی کو اسی مصلیٰ میں ایک سرو کے نیچے سپرد خاک کیا گیا یہ جگہ اب حافظیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابوالقاسم بابر نام کا ایک تیموری شاہزادہ ۸۵۶ھ میں فارس کا حکمران بن کر شیراز آیا۔ اُس کے حکم سے اس کے استاد اور وزیر مولانا شمس الدین

است کہ در دامنہء کوہ چہل مقام شمال شیراز قرار دار
و یکی از مناظر بسیار با نزہت کشورِ ایران است و مور د
ستایش خواجہ شیراز بودہ دور وصف آن گفتہ است''۔

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

خاک مصلیٰ جایگاہ مزار بسیاری از بزرگان و معارف بودہ است و دو تکیہو
خانقاہ بزرگ در آن جا بنام 'ہفت تنان'' ہنوز باقی باشد''

تکیہ ہفت تنان کے بارے میں ہماری جانکاری دلچسپی سے خالی نہیں۔
یہ جگہ بھی کوہ چہل مقام کے دامن میں واقع ہے اور اس کی عمارت کو کریم خان زند
نے بنوایا تھا۔اس کے ایک ایوان کی دیوار پر پانچ تصویریں منقش کی گئی ہیں۔جن
کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بالترتیب یوں ہیں۔

۱۔ شاہ شیخ ابواسحاق اور حافظ۔
۲۔ حضرت موسیٰؑ شبانی کرتے ہوئے
۳۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کی قربانی دیتے ہوئے
۴۔ شیخ صنعان اور دختر ترسا
۵۔ سید معصوم علی شاہ یا شیرازیوں کے مطابق شیخ سعدی۔

اس تکیہ میں سات گمنام عارفوں کی قبریں بھی ملتی ہیں لیکن اُن میں کسی کے
بھی سنگ مزار پر کوئی عبارت کندہ شدہ دیکھی نہیں گئی ہے۔

خواجہ حافظ کی کوئی مستند یا غیر مستند تصویر آج تک نہیں پائی گئی ہے۔
شاہ ابواسحاق کے ساتھ حافظ کی تصویر لوگوں کی کہی سُنی بات ہے۔اس کی حقیقت
کے بارے میں ہمارے پاس کوئی سند نہیں۔

خاک مصلیٰ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے استاد علی اصغر نے اپنے وقت یعنی

حافظیہ پر مزید تفصیل درج کرنے سے پہلے مندرجہ بالا غزل نمبرا ایک یعنی ایدل......الخ پر کچھ دل چسپ اطلاع کا درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

خاندان صفوی کے بانی شاہ اسماعیل نے جب ایران میں مذہب تشیع کو سرکاری مذہب قرار دیا تو کچھ متعصب لوگوں کے اثر میں آ کر وہ آمادہ ہوا کہ ایک حکم نامہ جاری کرے جس کی رو سے شیراز میں حافظ کے مقبرہ کو مسمار کیا جائے، کیوں کہ یہ لوگ حافظ کو سُنی خیال کرتے تھے اور اس کے دیوان کے پہلے شعر یعنی ''الا یا ایہا انساقی ادر کا سا گو دنا ولہا'' کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ جو دراصل یزید بن معاویہ کا مصرعہ ہے چناں چہ حکم نامہ جاری ہوا اور غالباً مقبرہ کے کچھ حصوں کو منہدم بھی کر دیا گیا ،لیکن جیسا کہ کئی تذکرہ نویسوں نے تصدیق کی ہے، شاہ اسماعیل صفوی نے دیوان حافظ سے فال نکالی، اور بشارت ملنے پر اس عمل سے منحرف ہوا۔ شعر یہ تھا۔

جو ز اسحر نہا دحمایل برابرم
یعنی غلام شاہم وسوگند میخورم

بعض محققوں کا خیال ہے کہ زیر بحث غزل یعنی ''ایدل غلام شاہ......'' حافظ کی نہیں۔ دانش مند محترم حسین پژمان نے اس کو حافظ کی اُن غزلوں میں شامل کیا ہے جن کے بارے میں شک اور تردید کی گنجائش ہے۔ ہاشم رضی نے حافظ کے شیعیہ ہونے کی بحث کے ضمن میں اس غزل کو پیش کیا ہے۔

استاد علی اصغر حکمت نے ''سعدی تا جامی'' کے صفحہ ۳۶۷ کے حاشیہ پر تذکرہ میخانہ کے حوالہ سے حافظ کے شیعیہ ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ایک مشہور داستان کو درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

''جب حافظ ابتدائی دور میں ناموزوں شعر کہنے کی بنا پر مایوس ہوا، تو ایک بار عالم یاس میں بابا کوہی کے آستانہ پر پہنچا، وہاں تین دن تک پڑا رہا، اور افطار

محمد معمائی (بقول صاحب شیراز یغمائی) نے حافظ کی آرام گاہ پر ایک مقبرہ بنوایا جو ایک گنبد اور ایک عمارت پر مشتمل تھا۔ اس سلسلہ میں میر علی شیر نوائی نے اپنے تذکرۂ مجالس میں یہ عبارت لکھی ہے:۔

"......مولانا محمد معمائی درزمان بابر میرزا صدر معظم
گردید...... درایام مکنت خود در شیراز در سرِ تربت
خواجہ حافظ گنبدی ساخت و بابر میرزا آنجا ضیافت کرد
اما یکی ازخوش طبعان شیراز بہ جانبی کہ نظر بہ میرزا افتد
ایک بیت را نوشتہ بود۔"

اگر چہ جملہ اوقات شہر غارت کرد
خدایش خیر دہاد کہ این عمارت کرد

گیارہویں صدی ہجری کے اوایل یعنی شاہ عباس صفوی کے عہد سے اس عمارت میں تعمیر اور ترمیم ہوتی رہی، لیکن اصلی عمارت کو ۱۱۸۹ھ میں کریم خان زند کے حکم سے بنوایا گیا، اس کی بنوائی ہوئی عمارت میں اس زمانے کے ہنر کا خاص طریقہ اور طرز پیش نظر تھا قبر پر سنگ مرمر کی ایک بڑی خوب صورت سل نصب کر دی گئی تھی جو اب تک برقرار ہے۔

اس سل پر حافظ کی درج ذیل دو غزلیں نہایت عمدہ نستعلیق میں کندہ کرائی گئی ہیں۔

۱۔ ایدل غلام شاہ جہاں باش دشاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف اللہ باش

....

۲۔ مژدۂ وصل تو کو کز سر جان برخیزم
طائر قدسم و از ہر دو جہان برخیزم

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
دندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

مکاشفۂ حافظؔ کے بارے میں شیرازیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ باباہی کے آستانہ پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ بل کہ چاہ مرتاض علی کے نزدیک ہوا تھا، چاہ مرتاض علی کی وضاحت گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

شیرازیوں کا کہنا ہے کہ جب حافظ نے شاخ نبات نام کی محبوبہ کے عشق سے ہٹ کر عشق حقیقی کی طرف رجوع کیا تو صبح دم اس پر ذوق و وجد کی حالت طاری ہوئی اور عالم مکاشفہ میں اُس نے اولیاء میں سے کئی ایک کا دیدار کیا۔ جنھوں نے اُسے شرابِ روحانی پلائی اور اُس کی زبان پر غیب سے غزل آئی۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

اس ضمنی تفصیل کے بعد ہم زیر بحث اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے یعنی:
''ایدل غلام شاہ جہان ......'' قبل اس کے کہ قارئین اس بحث کی متفرقات سے محظوظ ہوں، بہتر ہے پوری غزل کو اِن کی سہولیات کے لیے نقل کیا جائے، خاص کر جب دیوان حافظ کے عام نسخوں میں یہ غزل درج نہیں۔

ایدل غلام شاہ جہان باش وشاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف اللہ باش

از خارجی ہزار بہ یک جو نمی خرند
گوکوہ تا بکوہ منافق سپاہ باش

تک نہ کیا۔ دن رات تضّرع اور زاری کرتا رہا۔
تیسری رات منت اور سماجیت کی حالت میں تھا کہ
آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک سوار کو دیکھا، جس کے
گھوڑے کے نعل سے لے کر پیشانی تک نور ہی نور
تھا۔ اُس نے اپنا مبارک چہرہ حافظ کی طرف کر کے
کہا۔ '' اے حافظ اُٹھ! تیری مراد ہم نے پوری
کر دی۔ پھر ایک نہایت سفید لقمہ اپنے مبارک دہن
سے نکال کو حافظ کے منہ میں ڈالا، اور فرمایا کہ ہم نے
تم پر علم کے دروازے کھول دیے۔ فصاحت و بلاغت
میں تمھیں زمانے کا نادر انسان بنایا۔ لوگ تمہارے
اشعار کو ہاتھوں ہاتھ لیا کریں گے۔ تم روز ابد تک صفحہ
ہستی پر بطورِ یادگار باقی رہو گے۔''

خواجہ حافظ نے کہا میں نے زندگی بھر کبھی اتنا لذیز لقمہ نہیں کھایا اور نہ اس
قدرِ ذوق حاصل کیا تھا جو اس لقمہ سے مجھے حاصل ہوا۔ پھر وہ خورشید تاباں غائب
ہونے لگا۔ میں اس کے سامنے گیا۔ یکا یک مجھے ایک نیک سیرت وخوش صورت
بزرگ نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ نیر اعظم کہاں سے طلوع ہوا۔ اور اس کا
اسم مبارک کیا ہے؟ اس نے کہا عجب! کیا تم نہیں جانتے یہ ساقی شراب طہور ہے،
یہ وہی شخص ہے جس کی شان میں حضرت رسالتماب نے فرمایا ہے'' انا مدینۃ العلم و
علی بابہا'' میں شوق سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تا کہ اُن کے پاک قدم لوں اور سر اور جان کو
امیر مردان پر نثار کروں، موذن کی آواز کان میں پڑی خواب سے بیدا ہوا اور
باطن کو اس فایض الانوار کے دیدار اور قدوم مبارک سے متجلیٰ پایا۔ اس صبح کی روشنی
میں میرے دل کا سمندر موجزن ہوا، اور میں نے یہ غزل کہہ ڈالی

ہوئے علی دشتی کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور غزل زیر بحث کو حافظ کی غزل نہیں مانا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ بہت سی دوسری غزلوں، اور کئی افسانوں کی طرح یہ بھی حافظ سے منسوب کی گئی ہے۔ علاوہ ازین اس غزل میں کہیں بھی حافظ کی مخصوص روش کا نشان نہیں ملتا۔ بل کہ غزل نے روضہ خوانی کی شکل اختیار کی ہے اور یقینی طور پر اُس زمرہ کے اشعار میں ہے جو مدح گو منبر پر چڑھ کر پڑھتے ہیں۔ یہ کلام نہ خُشتمانہ ہے اور نہ اس میں حافظ کی مخصوص چاشنی اور گہرائی ملتی ہے جن سے علائق اور تعصّبات بشری الگ ہو چکے ہوں۔

اس ناقد نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ایسے اور اس طرح کے کئی اور اشعار حافظ کے ساتھ اس لیے منسوب کیے گئے ہیں کہ اُس کو اہل تشیع سے مانا جائے اور یہ کام ایسا بے ہودہ ہے کہ چند ایک اشعار کی بنا پر حافظ کو اہل سنت سے نسبت دی جائے، چناں چہ موخر الذکر قسم کے غرضمند لوگ عام طور پر حافظ کے سُنی ہونے میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

من ہمان دم کہ وضو ساختم از چشمہء عشق

چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

چناں چہ مذہب تشیع میں مردہ پر پانچ تکبیر پڑھی جاتی ہیں اور مذہب سُنی میں صرف چار۔ اس دلیل کو ردّ کرنے والوں نے شعر کی تشریح یوں کی ہے۔

چشمۂ عشق اور چار تکبیر تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ چار تکبیر فنا کے چار مقام ہیں۔ یعنی فنائے آثاری، فنائے افعالی، فنائے ذاتی اور فنائے صفاتی

بہر صورت یہ چند اشارے حافظ کے سنگ مزار پر کندہ کی گئی پہلی غزل سے متعلق تھے، اور جہاں تک دوسری غزل یعنی ''مژدۂ وصل تو کو کز سر جان بر خیزم'' کا تعلق ہے استاد حکمت نے ''از سعدی تا جامی'' میں لکھا ہے کہ اس غزل کے چند اشعار سنگ مزار پر منقش ہیں۔ راقم الحروف کو ۱۹۶۲ میلادی میں آرام گاہ حافظ کی

چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز
گو این تن بلاکش من پر گناہ باش

آنرا کہ دوستی علی نیست کافر ست
گو زاہد زمانہ وگو شیخ راہ باش

امروز زندہ ام بولای تو یا علی
فردا بہ روح پاک امامان گواہ باش

قبر امام ہشتم سلطان دین را
از جان ہوس وبر دران بارگاہ باش

دستت نمیرسد کہ بچینی گلی زشاخ
باری بپای گلبن ایشان گیاہ باش

مرد خدا شناس کہ تقوی طلب کند
خواہی سپید جامہ وخواہی سیاہ باش

حافظ طریق بندگئی شاہ پیشہ کن
وانگاہ در طریق چو مردان راہ باش

ہاشم رضی نے مقدمہ دیوان حافظ میں حافظ کے مسلک پر بحث کرتے

ہوئے علی دشتی کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور غزل زیر بحث کو حافظ کی غزل نہیں مانا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ بہت سی دوسری غزلوں، اور کئی افسانوں کی طرح یہ بھی حافظ سے منسوب کی گئی ہے۔ علاوہ ازین اس غزل میں کہیں بھی حافظ کی مخصوص روش کا نشان نہیں ملتا۔ بل کہ غزل نے روضہ خوانی کی شکل اختیار کی ہے اور یقینی طور پر اُس زمرہ کے اشعار میں ہے جو مدح گو منبر پر چڑھ کر پڑھتے ہیں۔ یہ کلام نہ محتشمانہ ہے اور نہ اس میں حافظ کی مخصوص چاشنی اور گہرائی ملتی ہے جن سے علائق اور تعصّبات بشری الگ ہو چکے ہوں۔

اس ناقد نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ایسے اور اس طرح کے کئی اور اشعار حافظ کے ساتھ اس لیے منسوب کیے گئے ہیں کہ اُس کو اہل تشیع سے مانا جائے اور یہ کام ایسا بے ہودہ ہے کہ چند ایک اشعار کی بنا پر حافظ کو اہل سنت سے نسبت دی جائے، چناں چہ موخر الذکر قسم کے غرضمند لوگ عام طور پر حافظ کے سُنی ہونے میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

من ہمان دم کہ وضو ساختم از چشمہءِ عشق

چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

چناں چہ مذہب تشیع میں مردہ پر پانچ تکبیر پڑھی جاتی ہیں اور مذہب سُنی میں صرف چار۔ اس دلیل کو ردّ کرنے والوں نے شعر کی تشریح یوں کی ہے۔

چشمہءِ عشق اور چار تکبیر تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ چار تکبیر فنا کے چار مقام ہیں۔ یعنی فنائے آثاری، فنائے افعالی، فنائے ذاتی اور فنائے صفاتی

بہر صورت یہ چند اشارے حافظ کے سنگ مزار پر کندہ کی گئی پہلی غزل سے متعلق تھے، اور جہان تک دوسری غزل یعنی ''مژدہءِ وصل تو کو کز سر جان برخیزم'' کا تعلق ہے استاد حکمت نے ''از سعدی تا جامی'' میں لکھا ہے کہ اس غزل کے چند اشعار سنگ مزار پر منقش ہیں۔ راقم الحروف کو ۱۹۶۲ میلادی میں آرام گاہ حافظ کی

چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز
گو این تن بلاکش من پر گناہ باش

آنرا کہ دوستی علی نیست کافر ست
گو زاہد زمانہ و گو شیخ راہ باش

امروز زندہ ام بولای تو یا علی
فردا بہ روح پاک امامان گواہ باش

قبر امام ہشتم سلطان دین را
از جان ہوس و بر دران بارگاہ باش

دستت نمیرسد کہ بچینی گلی ز شاخ
باری بپای گلبن ایشان گیاہ باش

مرد خدا شناس کہ تقوی طلب کند
خواہی سپید جامہ و خواہی سیاہ باش

حافظ طریق بندگی شاہ پیشہ کن
وانگاہ در طریق چو مردان راہ باش

ہاشم رضی نے مقدمہ دیوان حافظ میں حافظ کے مسلک پر بحث کرتے

حافظیہ گئے۔ اُنھوں نے ریا کار سید کے اس ناپسند دیدہ فعل سے متنفر ہوکر حافظ کی روح سے پوزش اور انفعال کے طور پر دیوان حافظ سے فال دیکھی تو یہ غزل نکلی۔

دلی کہ غیب نمایست جام جم دارد
زخاتمی کہ از وگم شود چہ غم دارد

بخط وخال گدایان مدہ خزینہ ءدل
بدست شاہ وشی دہ کہ محترم دارد

بہرحال مقبرہ خستہ حالت میں پڑا رہا اور ۱۳۱۹ ہجری میں فارس کے حاکم منصور میرزا شجاع السلطنہ نے منظفر الدین شاہ قاچار کے حکم سے اُس وقت کے دو ہزار تومان کے خرچہ سے آرام گاہ حافظ کی مرمت کروائی اور اس کے اطراف میں لوہے کی سلاخیں ڈھلوائی گئیں۔ یہ کام فن معماری کے استاد علی اکبر زین الدولہ (نقاش باشی) کی نگرانی اور سرپرستی میں انجام دیا گیا۔

مرحوم فرج اللہ بہرامی (دبیر اعظم) ۱۳۱۱ھ ہجری شمسی میں فارس کا گورنر ہوا۔ یہ دانشمند اور روشن دل انسان حافظ کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ اُس نے بھی آرام گاہ حافظ کے باغ اور اس کے ارد گرد دیوار میں مناسب مرمت کرانے کے بعد آرام گاہ کو نئی صورت دی۔

لیکن آرام گاہ حافظ میں اس وقت تک بنوائی گئی تعمیرات اور اُن کی مرمت وغیرہ اس شیرین زبان اور دُنیائے شعر کے بادشاہ کے شایاں شان نہ تھیں اتنے عظیم اور لافانی شاعر کے لیے ایک ایسی شاعرانہ اور شاندار عمارت کی ضرورت تھی جو حقیقت میں رندان جہان کے لیے زیارت گاہ بنتی۔ بہرحال خاندان پہلوی کے سب سے پہلے حکمران اور جدید ایران کے بانی رضا شاہ پہلوی نے اس کام کی

زیارت کا شرف حاصل ہوا اور اس وقت بھی اس غزل کے چند اشعار سنگ مزار پر
کندکیے گئے نظر آئے

کریم خاں زند کے بعد ۱۱۹۵ھ ہجری میں معتمد الدولہ فرہاد میرزا فارس کا
فرمانروا مقرر ہوا تو اُس کے حکم سے حافظ کی تربت پر لوہے کی سلاخیں لگائی گئیں
اور مختصر سی مرمت بھی عمل میں لائی گئی ۱۳۱۸ ہجری میں تہران میں یزد کے ایک شخص
ملا شاہ جہان یزدی نے دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

ای صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگوی
کای سرحق ناشناسان گوی میدان شما

اس سے متاثر ہوکر ملا شاہ جہان نے قبر پر ایک بلند بقعہ اور بارگاہ بنانے کا
بیڑا اُٹھایا لیکن ایک ظاہر پرست سید نے اعتراض کیا کہ ایک زردشتی کیوں کر حافظ
کی تربت پر بقعہ بنوائے۔ وہ بے ادب اور اوباش لوگوں کی ایک جماعت لے کر
حافظیہ پر آیا، اور ملا شاہ جہان کی بنائی ہوئی عمارت کو ڈھایا اور زردشتی کو اس کام
کے انجام دینے سے منع کیا۔

اس ناپسندیدہ عمل کے بعد اس سیدّ زادے نے مزید حماقت کا ثبوت
دیتے ہوئے قبر پر دو چار لاٹھیاں ماریں اور کہا

''اے درویش کچھ لوگ چاہتے تھے کہ تمھیں نجس
کریں، میں نے اُنھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں
دی''۔

سنگ مرمر کو باندھنے والی لکڑی میں اب بھی شکستگی کے جو آثار دکھائی
دیتے ہیں اور پتھر کی سِل میں جو شگاف پڑے ہوئے ہیں سب اسی نااہل سیدّ زادہ
کے کرتوت کی یادگار ہیں۔

اُن ہی دنوں حافظ کے کچھ روشن فکر شیدائی تربت کی زیارت کے لیے

قدم اُٹھائے جائیں۔

شیراز کے صاحبِ دل لوگ آرام گاہ حافظ کی خرابی سے محزوں اور آرزدہ خاطر تھے۔ میں بھی اس غم اور غصہ میں اپنے ہمشہریوں کا شریک تھا۔ میں ہمیشہ دل ہی دل میں سوچا کرتا کہ کس قدر لازمی ہے کہ ایک ایسی عمارت خواجہ حافظ کے مزار پر بطور یادگار بنائی جائے جو اس بلند پایہ شاعر کے مقام کے مناسب ہو، تاکہ اس طرح میں اس بزرگ کی نسبت اپنی فرض شناسی کی ایک ادنیٰ علامت باقی چھوڑوں۔ انہی دنوں ایک بوالفضول نے تہران میں چھپنے والے کسی رسالہ میں لسان الغیب خواجہ صاحب کے عالی مقام کی نسبت بے سبب گستاخی کی اور اِس پُر زوردار غزل کو اس کی خطا کاری کا ثبوت ٹھہرایا۔

گرمے فرش حاجت رندان روا کنند

ایزد گنہ ببخشد و دفع بلا کنند

ایک بار اہل دانش کی ایک جماعت بارگاہ خواجہ کی عمارت کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اکھٹی ہوئی۔ دورانِ گفتگو متذکرہ بالا بوالفضول کی بات بھی چلی۔ سب لوگوں نے اس نادان کی کم عقلی اور جہالت پر افسوس کا اظہار کیا جس کی بنا پر وہ شخص اُن بزرگوں کی اہانت کرتا تھا جو قوم کے لیے باعث فخر ومباہات ہیں۔ اس کے بعد حافظ کی آرام گاہ پر ایک خاص طرز کی عمارت پر بات چھڑ گئی۔ بہت بحث ومباحثہ ہوا۔ لیکن کوئی مثبت نتیجا نہ نکلا۔ سب مایوس ہوکر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اس لحاظ سے کہ تعلیمی خدمات میرے فرائض منصبی میں شامل تھیں اور خواجہ شیراز سے زیادہ ارادت رکھتا تھا میں باقی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ

طرف اپنی توجہ مبذول کی جس کے نتیجے میں موجودہ پرشکوہ اور مجلل عمارت اور باغ کی تعمیر انجام پائی۔ اس نیک کام میں استاد علی اصغر حکمت کا بڑا ہاتھ رہا جنھوں نے اپنی کتاب ''از سعدی تا جامی'' میں اس ضمن میں بڑی دل چسپ اطلاع دی ہے۔ جس کو یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

''اس کتاب کی نگارش کے وقت آرام گاہ حافظ ایک عظیم اور خوب صورت عمارت پر مشتمل ہے۔ جن دنوں میں (حکمت) ایران کی وزارت تعلیم میں مشغول خدمات تھا یہ عمارت اُنہی دنوں بحمد اللہ انجام پائی۔

سنہ ۱۳۱۰ ہجری شمسی میں شیراز کے کچھ خیر اندیش حکام نے حافظیہ کی قدیم عمارت جو کریم خان زند کے زمانہ سے باقی تھی اور جس میں خستگی اور بوسیدگی کے آثار نمایاں تھے، کی مرمت کا فیصلہ کیا۔ پُرانی عمارت پتھر کے چار ستونوں پر کھڑے دو رویہ ایوانوں پر مشتمل تھی اور اِن ستونوں کے درمیان پتھر کی دیوار کھڑی تھی اُس کو گرایا گیا اور اس جگہ نئی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا گیا لیکن افسوس کہ حوادث روزگار نے حافظ کے اِن عقیدت مندوں کو نئی عمارت پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فرصت نہ دی۔

سنہ ۱۳۱۳ ہجری شمسی میں فردوسی کی موزوں اور پُرشکوہ آرام گاہ بنانے کے سلسلہ میں ایران کے لوگوں میں اپنے بزرگان ادب کے آثار باقیہ کی از سر نو تعمیر اور اِن کی بقا کے بارے میں جوش و خروش پیدا ہوا۔ سب لوگ اس طرف متوجہ ہوئے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب اور فوری

شروع ہوکر ۵۰ ویں سال میں مکمل ہوئی تھی۔ داخلہ اور آرام گاہ کے باغ کا کل رقبہ دو ہزار مربع میٹر ہے۔ آرام گاہ کے دو حصے ہیں۔ ورودی اور غرب شرقی۔ اِن کے درمیان داخل ہونے کے لیے ۱۲ میٹر عرض کا ایک کشادہ راستہ ہے جس کے دونوں طرف باغیچے لگے ہوئے ہیں۔ ہر باغیچے کے وسط میں مستطیل شکل کا ایک حوض بنا ہوا ہے۔ جس کے پتھر یک پارچہ سل کے بنے ہیں۔ حافظیہ سے شیراز کا خوب صورت منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ باغ کی دوسری طرف جہاں آرام گاہ ہے داخل ہونے کی جانب سے قدرے اونچی جگہ ہے۔ اور اس کے تینوں طرف یعنی شمال مشرق اور مغرب میں سادہ عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ جو تقریباً نا متناسب سی ہیں۔ اس کے آس پاس کچھ نامور لوگوں کی قبریں ملتی ہیں۔ حافظ کی قبر وسط میں سطح زمین سے تقریباً ایک میٹر کی بلندی پر ہے۔ پتھر کے پانچ پایہ مزار کے اردگرد مدور شکل میں بنائے گئے ہیں مقبرہ کی چھت پتھر کے آٹھ ستوں پر کھڑی ہے اور اس کا اندرونی حصہ رنگین انیسٹوں اور ٹائلوں کا بنا ہوا ہے۔ مقبرہ کے گنبد کی بیرونی شکل درویشوں اور قلندروں کی ٹوپی جیسی ہے۔ چھت پر ایلومینیم کی چادریں بچھی ہوئی ہیں تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ اِن کا رنگ زنگاری اور ٹائیلوں جیسا ہوجائے۔ آرام گاہ کی چھت کے اندورنی حصہ میں ستوں یک پارچہ پتھر کی سلوں پر حافظ کی یہ غزل نہایت عمدہ خط میں کندہ کروائی گئی ہے۔

حجاب چہرہ جان میشود غبار تنم
خوشا دمی کہ ازین چہرہ پردہ بر فگنم

جن دو باغیچوں کا ذکر کیا گیا ہے اِن میں ایک وسیع اور مجلل ہال ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس ہال کا طول ۵۶ میٹر اور عرض سات میٹر ہے۔ اس میں پتھر کے بڑے بڑے ستون ہیں۔ وسط کے چار ستون یک پارچہ اور کریم خان زند سے متعلق ہیں۔ باقی دو پارچہ پتھر کے جدید زمانے کی ساخت کے ہیں۔

دل گیر اور ملول تھا۔ جا کر اپنی کوٹھری کے کونے میں غمگین پڑا رہا۔ معاً نصف شب کو مجھے سوجھی کہ حافظ کے دیوان سے فال نکالوں اور اس بزرگ کی روح پرفتوح سے استمداد حاصل کروں۔ میں نے اپنے دل میں نیت کی کہ آیا ممکن ہے کہ اس مقبرہ پرمجلل اور پُرشکوہ قبہ میرے جیسے ناتوان شخص کے ہاتھوں بن سکتا ہے؟ جب میں نے دیوان کھولا تو عجیب اتفاق سے وہی بیت پھر نکل آیا جو رات مجلس میں زیر بحث تھا یعنی:

گر میفروش حاجت رندان روا کند
ایزد گنہ ببخشد و دفع بلا کند

میں نے لسان الغیب کی روح پر فاتحہ بھیجی۔ خلوص سے سرشار ہو کر یقین کامل ہوا کہ اس مرد روشن دل کی ہمت سے میرا مقصد جلدی پورا ہوگا۔ بہت زیادہ وقت نہ گزرا کہ نیک ذرایع سے کافی روپیہ اکٹھا ہوا اور ۱۳۱۴ ہجری شمسی میں جب کہ میں ابھی وزارت تعلیم کا سربراہ تھا آرام گاہ پر ایک اونچا اور شاندار گنبد بننے لگا۔ خواجہ لسان الغیب کی قدسی روح اور اُس کے باطنی فیض کے نور سے یہ عمارت ۱۳۱۶ ہجری شمسی میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس کے لیے سرکاری خزانہ سے حتیٰ کہ ایک دینار تک کی منت نہ اُٹھانی پڑی۔ آرام گاہ پر نئی عمارت کی تعمیر کی نگرانی اس وقت صوبہ فارس کے محکمۂ تعلیم میں عمارات اور کارپردازی کے متصدی علی سامیؔ کے ذمہ تھی۔ اس شخص نے اس عمارت کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب ''شیراز'' میں لکھا ہے۔ اُسے مختصر طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''اس عمارت کا خاکہ ایک فرانسیسی آثار قدیمہ کے صلاح کار مسٹر آندرہ گڈارڈ (Andre Goddard) نے تیار کیا تھا لیکن اس کی بناوٹ میں بنیادی طرز کریم خان زند کے وقت کی ہی رکھی گئی تھی اور صرف موزوں تعمیر یا ترمیم عمل میں لائی گئی تھی۔ اصل تعمیر رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے ۱۵ ویں سال میں

من غلام نظر آصف عہد م کو را

صورت خواجگی وسیرت درویشاں است

آصف عہد سے مراد حافظ کا ممدوح خواجہ جلال الدین توران شاہ ہے جس کے متعلق ذکر اگلے باب میں آئے گا۔شاید مامورین نے کسی مصلحت کے تحت یہ شعر کتبہ ہی نہ کروایا ہو۔۸۲-۱۷ء ہجری شمسی میں تاج الدین احمد وزیر کے حکم سے شیراز میں فضلا کی ایک جماعت کے ذریعہ ایک مجموعہ تیار کروایا گیا تھا جس میں اُنھوں نے اپنے خط میں شاعروں کا نمونہ کلام درج کیا تھا شرکت کرنے والوں میں ایک شخص بنام مظفر الدین ملک السلیمانی نے حافظ کی یہ غزل لکھی جس میں آصف عہدم والا شعر شامل ہے۔البتہ اُس نے غزل کا مطلع یوں لکھا تھا۔

حافظ آنجا بہ ادب باش کہ سلطانی و ملک

ہمہ از بندگی حضرت درویشان است

ہال کے باہر کی طرف پیشانی پر جس کا رُخ داخلہ کے باغ کی طرف ہے۔لاجوردنگ کی اینٹوں سے معرق درج ذیل مطلع کی غزل کندہ ہے۔

گلعذاری ز گلستان جہان مارا بس

زین چمن سایہ آن سرو روان مارا بس

اس کے بعد عمارت کی تاریخ تکمیل (۱۳۱۶ء ہجری شمسی) کندہ ہوئی ہے اصل عبارت یوں ہے۔

''ساختمان آرام گاہ خواجہ شمس الدین محمد شیرازی بر جسب امر اعلیٰ حضرت ہمایون شاہشاہ ایران رضا شاہ پہلوی بدستور جناب حکمت وزیر معارف واوقاف وصنائع مستطرفہ در سنہ یک ہزار سی صد وشاتردہ ہجری شمسی انجام پذیرفت۔''

ہال کے دونوں طرف کی دیواریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں جن کے بلالائی حصوں میں سنگ مرمر کے کتبے ہیں۔ اِن پر حافظ کی مشہور غزلیں امیر الکتاب کردستانی احمد جو اپنے وقت کے مشہور و معروف ثلث نویسوں میں پہلا مقام رکھتا تھا کے خط ثلث کے عکس سے کندہ کروائی گئی ہیں۔ اِن کی ترتیب اس طرح ہے دیوان کے شر قی حصہ میں پیشانی والے کتبہ پر یہ غزل ہے

روضہ ضلد برین خلوت درویشان است
مایہ محتشمی خدمت درویشان است

غزل کا مندرجہ ذیل شعر مغزلی پیشانی والے کتبہ پر کندہ ہوا ہے۔

ای تو انگر مفر دش نخوت کہ ترا
سیم و زر درکنف ہمت درویشاں است

چوں کہ اس غزل کا ذکر آیا ہے مناسب ہے کہ ہم اس ضمن میں کچھ فروعی اطلاعات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کریں۔

شعاع السلطنت کے زمانے میں عبدالصمد معروف بہ للہ ہاشی ایک باذوق اور ہنرمند آدمی تھا۔ اُس نے اس غزل کو امیر الکتاب کے خط سے اُٹھا کر کاغذ کے ایک سیاہ تختہ پر چسپان کیا تھا اور سنگ مرمر کے متذکرہ بالا کتبے اسی خط سے استنساخ ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم غنی کے دیوان حافظ میں اس غزل کے آخر میں ایک اور شعر دیکھنے میں آیا جو یوں ہے۔

چو در خاک مصلیٰ یافت منزل
بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

حافظؔ کی قربت میں کئی شخصوں کو دفن کیے جانے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو علمی اور ادبی لحاظ سے زیادہ مشہور نہیں تھے۔ مگر اِن سے قطع نظر کچھ ایسی نامور ہستیاں بھی ہیں جو علم و ادب کی دُنیا میں بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کا ایک شاعر مولانا اہلی شیرازبھی یہیں دفن ہے۔ اس کے سنگ مزار پر اس کی اپنی ہی کندہ کی گئی یہ رباعی ہے۔

دوش از عمر رفتہ در منزل خویش — در فکر فرد شدم و لی با دل ریش
از حاصل عمر در کفم ہیچ بنود — شرمندہ شدم ز عمر بی حاصل خویش

ایک اور دانشور اور تاریخ دان فرحت اللہ شیرازی متوفی ۱۳۰۰ ہجری شمسی کو بھی تربتِ حافظ سے قربت نصیب ہوئی۔ (سخنوران ایران)

اب ایران میں دفن اموات کے وزارت خانہ کے حکم کے تحت آرام گاہ حافظؔ کے احاطہ میں کسی بھی اسم و رسم کے انسان کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ہال کے باہر مقبرہ کی طرف والی پیشانی پر لاجوردی زمین پر خط ثلث میں ٹائلوں پر یہ غزل درج ہے۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

مقبرہ کے اردگرد ٹائلوں میں خط ثلث میں اور کئی غزلیں ثبت ہو چکی ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے شمالی دیوار کے کتبہ پر

سحرم ہاتف میخانہ بہ دولت خواہی

گفت باز آی کہ دیرینہ این درگاہی

مقبرہ کا احاطہ کرنے والے مغربی ضلع کے کتبہ پر

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد ست

بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است

اسی محوطہ کی مشرقی دیوار کے کتبہ پر

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو

یادم از کشتہ خویش آمد و ہنگام درو

سنگ مزار کے بالائی گوشہ پر یہ بیت کندہ ہوا ہے۔

بر سر تربت ما چون آئی ہمت خواہ

کہ زیارتگہ رندان جہان خواہد بود

اور نچلے گوشہ پر

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ

کہ شمعی بود از نور تجلی

حافظؔ کا مختصر ذکر کرنے والے تین دستوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

ا۔اوّل وہ معاصرین یا اُس زمانے کے بہت قریب کے شاعر، مورخ، اور راوی وغیرہ جنھوں نے اپنی نگارشات میں مختلف مطالب کے دوران ضمنی طور پر اُس کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ دوسرے وہ تذکرنویس جنھوں نے یا تو اپنی کاوش سے یا ایک دوسرے سے منقول حالات، حکایات اور روایات کو دیگر شاعروں کے بارے میں لا کر حافظؔ پر بھی کچھ اطلاع ہم تک پہنچائی ہے۔

۳۔ تیسرے دور حاضر میں ایران کے محقق، ناقد اور مبصر، جنھوں نے حافظ کے احوال اور اس کی شاعری پر اپنی دانست کے مطابق روشنی ڈالی ہے

پہلی جماعت کے لوگوں نے عام طور پر کسی واقعہ کی مناسبت سے حافظؔ کا شعر یاد دلایا ہے اور اُس کے ساتھ کوئی ملحق حکایت یا روایت بیان کی ہے۔ہم سب سے پہلے گروہ اوّلین مآخذ پر روشنی ڈالیں گے۔

ا۔المعجم فی معاییر اشعار العجم تالیف ۷۸۱ ہجری۔ محمد بن قیسؔ رازی کی مشہور کتاب المعجم کے موجودہ نسخہ کی کتابت ابن فقیہہ نام کے ایک شخص نے ۷۸۱ہ ہجری میں بغداد میں کی تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ کی کتابت حافظ کی وفات سے صرف گیارہ سال پہلے انجام پائی تھی تشبیب غزل کے باب میں موئف نے عمادی کے اشعار کے شواہد کی جگہ حافظ کی غزل کو پیش کیا ہے حافظ کے علاوہ اُس نے سید جلال الدین عضد، اور سلمان ساوجی کی غزلیں بھی بطور سند لائی ہیں۔

دوسرا باب

حافظؔ کے حالات زندگی کے مآخذ

برتو خوانم ز دفتر اخلاق

آیتی در وفا و در بخشش

منظفر الدین ملک سلیمانی کے نام کے شخص نے مندرجہ ذیل غزل اور قطعہ کو ترتیب سے اس مجموعہ میں درج کیا ہے۔

غزل:۔

روضہ خلد برین خلوت درویشان است

پایہ محتشمی خدمت درویشان است

قطعہ:۔

بسمع خواجہ رسان ای ندیم وقت شناس

بخلوتی کہ در آن اجنبی صبا باشد

۳۔مواہب الٰہی ۔اس کا موئف معین الدین یزدی۔امیر مبارز الدین اور اس کے بیٹے شاہ شجاع کا ہمعصر تھا اور علم حدیث میں بڑی دسترس رکھتا تھا۔ ۷۶۰ہجری میں اُس نے مواہب الٰہی نام کی تاریخ لکھی جس میں حافظ کے یہ شعر بطورِ سند پیش کیے لیکن استشہاد کی وجہ نہیں بتائی۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت قلندری داند

نہ ہر کہ آئینہ ساز د سکندری داند

نہ کہ طرف کلہ کژ نہاد تند نشست

کلاہ واری و آئینِ سروری داند

۴۔دیوان روح عطار: روح عطار حافظ کے ہم عصر شاعروں میں سے تھا جس نے واضح طور پر حافظ کا نام لیا ہے۔دیوان روح عطار کے ایک نسخہ کی کتابت ۸۵۵ہجری میں ہوئی تھی اور وہ کتاب خانہ شورای ملی تہران میں محفوظ ہے۔اس میں خواجہ قوام الدین محمد صاحب عیار کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔روح عطار نے حافظ

حافظؔ کی متذکرہ غزل یہ ہے:۔

عکس روی تو چو در آئینہ جام افتاد
عارف از خندۂ می در طمع خام افتاد

لیکن ہاشم رضی کے چھاپے ہوئے دیوان میں یہ شعر یوں دیکھا گیا ہے۔

عکس روی تو چو در آئینہ جام افتاد
عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

گمان ہوتا ہے کہ حافظ نے سلمان ساوجی کی غزل سے اقتدا کی ہو، جو یوں ہے۔

از ازل عکس می لعل تو در جام افتاد
عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

المعجم کا زیر نظر نسخہ اس وقت کتاب خانہ محمد علی فروغی سے متعلق ہے۔

۲۔ مجموعہ تاج الدین احمد وزیر شاہ شجاع، تالف ۷۸۳ ہجری۔ یہ مجموعہ حافظؔ کی وفات سے قبل تاج الدین احمد کے حکم سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں اُس وقت کے کئی فاضلوں نے اپنے خط میں چند صفحے لکھے تھے۔ اس میں چار بار حافظؔ کے اشعار کو نقل کیا گیا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں شہاب الدین المرحوم شمس محمد شہاب ہے جس نے بزرگوں کے اشعار نقل کرتے ہوئے حافظ کی درج ذیل مطلع کی غزل کو نقل کیا ہے۔

خدا کہ صورت ابروی دل کشای تو بست
کشاد کار من و کرشمہ ہائے تو بست

دوسرا شخص جس نے حافظ کی مندرجہ ذیل مطلع کی غزل درج کی ہے۔ احمد بن محمد الحسینی ہے

ملوک مملکت نظم و نا قدا ان سخن
کہ باد خاطر ایشان ایمن از حدوث زمان

ز ا ہل طبع گر د ہی مخا لفت دا رند
پی ترا جح ا شعا ر حا فظ و سلما ن

گر د ہی ا ز فضلا متفق کہ این بہتر
جما عتی د گر ا نکا ر میکنند کہ آ ن

نبو ک خا مہ گہر نثا ر سحر نما ی
بیا ن کنید کز ین د و کرا بو حجا ن

روحؔ نے جواب میں یہ منظومہ لکھا تھا:۔

نمو د ہ ا ند چنین ما لکا ن ملک سخن
بااین کمینہ کہ از پیر فکر خویش پپر س
چو کر دم این سخن از عقل استفسا ر
بگو کہ شعر کدا مین از ین د و نیکو تر
جواب داد کہ سلمان بدہر ممتاز است
وگر طر وات الفاظ جزیل حافظ بین
یکی بگا ہ بیان طوطی است شکر بار
ز بُرج حا فظ این ماہ نظم رخشندہ
درین محاسن اخلاق چوں عنب پُر بار
یکی بگلشن نظم است سوسن آزاد

کہ کردہ اند مسخر جہان ز تیغ بیان
کہ نطق حافظ بہ یا فصاحت سلمان
کہ ای خلاصۂ ادوار وزبدۂ ارکان
کہ بردہ اند کنون شہرت از میدان
بلفظ دل کش معنی بکر وشعر روان
کہ شد بلاغت اورشک چشمۂ حیوان
یکی بنظم روان بلبلیست خوش الحان
زدُرج فکرت آن لو، لو سخن ریزان
دران فنون فضائل چو دانہ در رمان
یکی بباغ لطائف چو لالہ نعمان

کے ہم عصر شاعر سلمان ساوجیؔ اور حافظؔ کے اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے ایک قطعہ لکھا ہے جو اس کے دیوان میں موجود ہے۔ روحؔ عطار اور متذکرہ بالا قطعہ کے بارے میں استاد حکمت نے یہ عبارت لکھی ہے۔

"...... کتاب خانہ شوری ملیؔ میں شمارہ ۱۱۸۳ کے تحت
ایک دیوان کا قلمی نسخہ ہے۔ جو جلال الدین عضد سے
منسوب ہوا ہے۔ اس کی کتابت ۷۵۵ھ
ہجری میں ہوئی ہے"

اس کے بعد ایک اور دیوان ہے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن اسی شخص کے خط میں ہے جس نے اوّل الذکر دیوان رشتہ تحریر میں لایا ہے۔ اس کا نام دیوان روح عطار ہے اور اس بیت سے شروع ہوتا ہے۔

الٰہی پرتو از نور اسرار
تجلی کن بجان روح عطار

روحؔ عطار شیراز کا شاعر اور لُرستان کے اتابکوں میں سے اتابک افراسیاب کا مدح گو تھا۔ شاہ شجاع مظفری کا ہم عصر ہونے کے علاوہ اس نے خواجہ قوام الدین محمد بن عیار کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ روحؔ عطار کی جو غزلیں ہم تک پہنچی ہیں اُن میں عرفان پند و نصائح جیسے موضوعات ملتے ہیں۔۔ اُس نے کبھی روح اور کبھی روحی تخلص کیا ہے۔ اس قلمی نسخہ میں ایک قطعہ بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو چند باذوق دوستوں نے سلمان اور حافظؔ کے درمیان موازنہ کرنے کو کہا تھا۔ اور اُس نے دونوں کو مساوی کر کے اپنی علمی ذہانت کا ثبوت دے کر اپنے کو ایک مشکل سے آزاد کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں اِن دونون اُستادوں کی شہرت اور اِن کا کمال اپنی بلندی کا پہنچ چکے تھے۔ سوال اور جواب کے دونوں قطعہ قارئین کی نظر سے گزارے جانے کے قابل ہیں۔

میں مل سکتی ہے۔ استاد علی اصغر حکمت نے کہیں بھی صریحاً یہ نہیں کہا ہے کہ مندرجہ بالا قطعہ میں حافظ شیرازی کی طرف اشارہ ہے۔

۶۔ ظفرنامہ: ۸۰۶ھ نظام الدین شامی نے امیر تیمور کے حکم سے ۸۰۴ ہجری میں یعنی حافظ کی وفات کے بارہ سال بعد ظفرنامہ لکھنا شروع کیا اور اپنے سال وفات یعنی ۸۰۸ ہجری تک کے حوادث کو بیان کرتا رہا۔

اس کتاب میں موئف نے صرف ایک جگہ حافظ کا شعر نقل کیا ہے۔ جب تیمور نے شیراز سے مراجعت کی اور عراق کا رُخ کیا تو اس ضمن میں شامی نے یہ عبارت لکھی ہے:۔

''امیر صاحب قران دراوج کامگاری وقتدار بہ عیش و
طرب مشغول شد وسوای ملک خانم دتومان آغا طرب
ہای پادشاہانہ کردند بہ آواز ہای خوش الحان دلپند یز
ہوش ربودہ درمقام نوشانوش بہ عشرت وکامرای
گزاریندنداز سرفارغ بال بہ زبان حال میگفتند!''

یک دوروزی کہ درین مرحلہ فرصت داری
خوش برآسای زمانی کہ زمان این ہمہ نیست

(ظفرنامہ نظام شامی چاپ بیروت صفحہ ۱۳۲)

۷۔ دیوان اطعمہ شیرازی (۸۱۴ ہجری) حمام الدین اطعمہ شیرازی قطعی طور پر حافظ کا ہم عصر تھا اور اس کی اکثر غزلوں کی پیروی کرتا رہا۔ اس ضمن میں مفصل اطلاع کے لیے ڈاکٹر قاسم غنی کی تالیف ''عصر حافظ'' جلد اوّل ملاحظہ ہو۔

۸۔ تاریخ جغرافیائی (۸۲۰ ہجری) حافظ آبرو کی یہ تالیف کئی واقعات کی اطلاع کے لحاظ سے بڑی اہم ہے۔ اس کتاب کے تیسرے باب میں ہم اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالیں گے۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو اُس نے تیمور کے بیٹے

یکی موافق طبع لطیف ہمچوں عقل یکی مناسب چشم شریف ہمچو جان

ہزار روح فدای دم چو عیسی این

ہزار جان گرامی نثار گفتہ آن

۵۔ دیوان کمال خجندی:۔ کمال خجندی حافظ کا ہم عصر شاعر تھا اور اس کی وفات کے گیارہ سال بعد ۸۰۳ھ ہجری میں فوت ہوا۔ اگرچہ تاریخ نویسوں کے درمیان اس کے سال انتقال پر کافی اختلاف رہا ہے۔ کمال نے بارہا حافظ کی غزلوں سے اقتدار کیا ہے اور صریحاً حافظ کا نام لیا ہے مثلاً

حافظ:۔

ستارہ ای بدرخشیہ و ماہ مجلس شد

دل رمیدہ ما را انیس و مونس شد

کمال:۔

شبی کہ روی تو مرا چراغ مجلس شد

بسوختن دل پردانہ اش مہوس شد

نشد بطرز غزل ہمعنان ما حافظ

اگرچہ در وصف رندان ابوالفوارس شد

کمال کی ایک اور غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا ہست اکثر غزل ہفت بیت چو گفتار سلمان نرفتہ زیاد

کہ حافظ ہمی خواند اندر عراق بلند در دانش چو سبع شداد

یہ بنیاد ہر ہفت چون آسمان کزین جنس بیتی ندارد عماد

حافظ سے کمال کی اقتدا یا اس کے برعکس صورت حال کی بیشتر جانکاری، شعر العجم تاریخ ادبیات ایران یا اس کے برعکس پروفیسر براؤن اور ''از سعدی تا جامی''

وفات کے صرف اکتیس برس بعد ایران سے دور بین النہرین کے شمال میں ماردین تک جو عبدالحی کا آبائی وطن تھا، اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔ شاہ شجاع کے فارسی کے دیوان کو استاد سعید نفیسی نے بڑی محنت کے بعد جمع کر کے تہران میں ایک مبسوط اور قابلِ قدر مقدمہ کے ساتھ چھاپا اور احمد کسروی نے بھی اپنے بعض مقالات میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۔ظفر نامہ تیموری:۔شرف الدین علی یزدی نے اپنی مشہور تاریخ ''ظفر نامہ'' کو حافظ کی وفات کے صرف چھتیس برس بعد یعنی ۸۶۲ ہجری میں مکمل کیا تھا۔ اس میں متعدد موقعوں پر حافظ کے اشعار نقل کیے ہیں، اس کی بے شمار تمثیلوں، تمسکوں، اور شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا دیوان اس کے معاصرین اور قریب العصر اشخاص میں عام طور پڑھا جاتا تھا اور کافی مقبول تھا۔

۱۱۔انیس الناس۔(۸۳۰) شجاع شیرازی، شیراز کے حکمران بادشاہ شیخ ابواسحاق اینجو کے چچازادوں میں سے تھا۔ اس نے ۸۳۰ میں ''انیس الناس'' کے نام سے ایک رسالہ ''شاہرخ'' میرزا کے لیے لکھا تھا۔ رسالے کا موضوع عام طور پر حکمت عملی ہے۔ اس میں موئف نے حافظ اور تیمور گورکانی کے درمیان ملاقات اور اس سے متعلق مشہور لطیفہ درج کیا ہے، وہ شعر بھی درج کیا ہے جو اس تاریخی ملاقات سے وابستہ کیا گیا ہے یعنی

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندو یش بخشم سمرقند و بخارا را

اس داستان کے بارے میں ہم اگلے صفحوں میں کچھ تفصیل درج کریں گے۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے ''تاریخ عصر حافظ'' کی پہلی جلد کے صفحہ ۵ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ۔

''کوئی شخص انیس الناس'' کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانہ

شاہرخ کے حکم سے لکھا تھا۔ شاہ شجاع کی موت کا ذکر کرتے ہوئے یہ عبارت درج ہوئی ہے۔

''ولادت شاہ شجاع در بیست دوم جمادی الآخر ثلث و ثلثین و سبع مایہ............ وفات اور در بیست دوم شعبان پنجاہ وسہ سال و دوماہ عمر یافت، مولانا شمس الدین حافظ شیرازی در تاریخ وفات شاہ شجاع گفتہ است''

رحمان لا یموت چون آن پادشاہ را
دید آن چنان کز دعمل الخیر لا یموت
موتش قرین رحمت خود کرد تا بود
تاریخ سال واقعہ رحمان لا یموت

۹۔ دیوان غزلیات شاہ شجاع ۸۶۳ھ ہجری شاہ شجاع علم دوست تھا اور حافظ کا ممدوح۔ فارسی کے علاوہ عربی پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کی فارسی غزلیات کو سعد الدین انسی نے ایک دیوان میں جمع کیا تھا اور بین النہرین کے ایک شخص عبد الحی نے اپنے خط میں اس کی کتابت کی تھی۔ اس دیون کے عنوان میں یہ عبارت درج ہے افتتاح دیوان السلطان الاعظم ابی الفوارس شاہ شجاع تعمد اللہ برحمتہ

عبد الحی نے اس عنوان کے مقابل میں متن کے ہی خط میں اس عبارت کا اضافہ کیا ہے۔

''...... این شاہ شجاع ممدوح خواجہ حافظ شیرازی است علیہا الرحمتہ''

عبد الحی نے اس مجموعہ کو ۸۲۳ھ ہجری میں یعنی خواجہ حافظ کی وفات کے اکیس سال بعد لکھا تھا۔ اس سے ایک دل چسپ بات کا پتا چلتا ہے کہ خواجہ حافظ کی

کے اشعار بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ بعض اوقات حافؔظ کا نام لیے بغیر ایسے اشعار درج ہوئے ہیں اور بعض اوقات حافؔظ کو گونا گون القاب سے یاد کر کے اس کے اشعار نقل کیے ہیں۔ القاب بالعموم یوں ہیں۔

شیخ العارفین املح الشعراء (نسخہ جامع التواریخ کتاب خانہ ملّی تہران)

۱۴۔ تاریخ جدید یزد:۔ (۸۶۲ھ ہجری) یہ احمد بن حسین الکاتب یزدی کی پر مایہ تاریخ ہے جس کی تالیف ۸۶۲ھ ہجری کے قریب تکمیل کو پہنچی تھی۔ موئف نے تین بار حافؔظ کے اشعار کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ پہلی بار یزد کی قدیم عمارتوں کے کھنڈرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''...... وکنت راز ندان ذوالقرتین خوانده اند، چناچہ مولانائے اعظم شمس الملتہ محمد احمد حافظ شیرازی فرموده است۔

بیت

دلم از وحشت زندان سکندر بگرفت رخت بر بندم وتا ملک سلمان بردم

تازیان راچوغم حال گرانباران نیست پارسایان مددی تا خوش وآسان بردم

مقصود آنکہ بنای یزد سکندر ساخت وجہت زندان پرداخت۔

بعض نسخوں میں دوسرا شعر اس طرح پایا گیا ہے۔

نازکان راچوغم حال گرانباران نیست سازباناں مددی تاخوش وآسان بردم

تازیان یزد دراصل یزد میں واقع ایک محلّہ کا نام تھا اور گمان یہ ہے کہ غزل مذکور اُن غزلوں میں شامل ہے جو حافؔظ نے یزد میں اپنے قیام کے دوران کہی تھیں، اور پہلے مصرع میں ''نازکان'' کی جگہ ''تازیان'' کا ہونا قرین قیاس ہی نہیں بل کہ صحیح تر ہے۔ دیوان حافؔظ مرتبہ ڈاکٹر قاسم غنی اور مرتبہ ہاشم رضا میں ''تازیاں'' اور ''پارسایان'' دیکھے گئے ہیں۔

ملّی تہران میں فروخت کرنے کی غرض سے لایا۔
کتاب خانہ کے ماموریں کی طرف سے علاّمہ
محمد قزوینی کو اس پر اپنی رائے دینے کے لیے کہا گیا۔
مطالعہ کرتے وقت علامہ قزوینی نے اس میں حافظ اور
امیر تیمور سے متعلق حکایت دیکھی اور اس کو الگ نقل کیا۔"

۱۲۔ مجمل فصیحی: اس تاریخ کا مولف فیصحی خوانی ۷۷۰ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ حافظؔ کی وفات کے وقت اس کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ فیصحی نے دو بار اپنی تاریخ میں حافظؔ کا ذکر کیا ہے۔ پہلی بار ۷۹۲ھ ہجری کے واقعات درج کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے۔

"وفات مولانا واصم افتخار الا فاضل شمس الملتہ والدین محمد حافظ شیرازی الشاعر بہ شیراز فوناً بہ کت درو تاریخ او گفتہ اند۔

بسال ب وص و ذا بجد　　ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلی روان شد　　فرید عصر شمس الدین محمد

(یاداشت، فصیحی خوانی نے شیخ سعدیؔ کے مدفن کو بھی "کت"، ہی لکھا ہے۔)

دوسری بار ۸۰۷ ہجری کے واقعات درج کرتے ہوئے خواجہ احمد تونسی کا ہرات میں بطور حاکم مقرر ہونے اور لوگوں کے ساتھ بُرے سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت سید جنابذی تبریز سے آرہا تھا اُس نے خواجہ احمد کے نام ایک خط میں حافظؔ کا یہ شعر درج کیا۔

چشمت بعشوہ خانہ مردم خراب کرد
مخموریت مباد کہ خوش مست میردی

۱۳۔ جامع التواریخ حسینی: ۔(۸۵۵ھ) جامع التواریخ کے مولف حسن بن شہاب یزدی نے اپنی کتاب ۸۵۵ھ ہجری میں مکمل کی تھی، اس میں کئی بار حافظؔ

چناں چہ یہ آباد اور خوش حال شہر آناً فاناً تباہ ہو گیا۔ بربادی کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ چناں چہ شیراز کا بلبل داستان سرا یعنی خواجہ حافظ گلشن شیراز میں یوں نغمہ سرا ہوا۔

بخوبان دل مدہ حافظ ببیں آن بے وفائیا　　کہ باخوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

یہ بیت حافظ کی اس مطلع کی غزل کا ہے۔

سحر با باد می گفتم حدیث آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

پروفیسر براؤن نے متذکرہ شعر کو یوں درج کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ کئی اور لوگوں نے اس طرح لکھا ہے۔

بشعر حافظ شیراز می قصند و می نازند　　سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

ڈاکٹر قاسم غنی نے شاہ شجاع کے بیٹے زین العابدین کی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے حافظؔ کے اِن دو اختلافی شعروں کے قضیہ کو اپنی دانست میں حل کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ غزل کا اشارہ زین العابدین کی طرف ہے دراصل غزل کا مقطع یوں تھا۔

بخوبان دل مدہ حافظؔ ببیں آن بی وفائیہا　　کہ باخوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

لیکن بعد میں جب تیمورؔ ۷۸۹ھ ہجری میں فارس پر حملہ آور ہوا تو خواجہ حافظ نے مصلحتاً مقطع کو یوں بدل دیا۔

بشعر حافظ شیرازی گویند و می بازند　　سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

بیت

سکندر را نمی بخشند آبی بزور و زر میسر نیست این کار

روز وصل دوست داران یاد باد یاد باد آن روزگاران یاد باد

۱۵۔ دیوان البسہ : مولانا نظام الدین قاری یزدی نے بسحاق الطعمہ کی تقلید کرتے ہوئے دیوان البسہ کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا، البسہ نے حافظ کے اشعار کی پیروڈی (Parody) اسی طرح کی جس طرح اطعمہ نے کی ہے۔ اس ضمن میں ہم مزید تفصیل اگلے باب میں دیں گے۔ لیکن مفصل اطلاع کے لیے ''مقدمہ تاریخ عصر حافظ'' مرتبہ ڈاکٹر قاسم غنی ملاحظہ ہو۔

(٦) مطلع السعیدین (۸۷۵ھ) عبدالرزاق سمرقندی نے اپنی تاریخ مطلع السیدین میں متعدد موقعوں پر صراحت سے حافظ کا نام لیا ہے اور مناسب جگہوں پر اُس کے اشعار سے استشہاد کیا ہے ہم یہاں ایسے صرف دو موقعوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) امیر مبارزالدین کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہے۔

''امیر مبازالدین سادات وعلمارا معزز مئوقر داشت دور امر معروف و نہی منکر بہ نوعی سعی نمود کہ کس را یارا نبود کہ نام ملاہی ومناہی برد ومولانا شمس الدین محمد شیرازی درآن زمان می فرمایند:۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزاست

ببانگ چنگ مخوری کہ محتسب تیزاست

(۲) سال ۷۸۱ ہجری کے واقعات اور خوارزم پر چڑھائی اور فوری فتح کا حال لکھتے ہوئے عبدلرزاق سمرقندی نے بیان کا ہے کہ

'امیر تیمور کے لشکر نے خوارزم کے خزانوں کو لوٹا، عمارات کو ڈھایا اور ظلم و بیدارگری کو عام کیا۔

مقدمہ اور حواشی کے ساتھ چھاپی۔ اِن تذکروں کے علاوہ اور بھی کئی مآخذ ہیں جو غالباً پروفیسر براؤن یا شبلی کی دسترس میں نہ تھے، اور محققوں نے اِن سے حتی الامکان استفادہ کیا ہے۔ گو اِن دیر آشنا تذکروں سے حافظ کے حالات کی جانکاری میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا تاہم اِن کو غیر لازمی قرار دے کر نظر انداز کرنا اصول تحقیق کے منافی ہے۔ اس قسم کے مآخذ میں یہ کتابیں شامل کی جاسکتی ہیں۔

(۱) مجالس العشاق:۔ اس کو سلطان حسین بایقرا سے منسوب کیا جاچکا ہے اگرچہ بعض محققوں کے نزدیک اس میں شک و تردید کی گنجائش باقی ہے۔ بابر نے اپنی تالیف بابر نامہ میں اس انتساب کو نہیں مانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ایک شخص بنام کمال الدین گازرگانی کی تالیف ہے، وہ صوفی منش آدمی تھا۔ اور میر علی شیر نوائی کی مجلسوں میں اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ بہرحال اس کی تاریخ تالیف ۹۰۸ ہجری ہے اور مطبع نولکشور میں ۱۳۱۴ء میں چھپ چکی ہے۔

(۲) عرفات العاشقین:۔ یہ تقی بن معین الدین اوحدی (۱۰۲۲ھ) ہجری کی نگارش ہے اس کا عکسی نسخہ آقای محمد سہیلی خوانساری کے پاس موجود ہے۔ اس میں حافظ سے متعلق کئی دل چسپ اشارات ہیں

(۳) لطائف الخیال:۔ یہ محمد بن الدارائی کی تالیف ہے اور غالباً ۱۰۶۷ھ ہجری میں مکمل ہوئی ہے۔ اس کا نسخہ کتاب خانہ ملک تہران زیر شمارہ ۴۳۲۵ میں موجود ہے۔

(۴) خلاصۃ الافکار۔ تالیف ابوطالب تبریزی (۱۲۰۵ھ) زیر شمارہ ۴۳۰۱ کتاب خانہ ملک تہران

(۵) ریاض الشعرا:۔ تالیف علی قلی خان والہ داغستانی ۱۱۶۱ھ) زیر شمارہ ۴۳۰۱ کتاب خانہ ملک تہران

اہم اور مستند تذکرے

اب تک ہم نے جو ماخذ پیش کیے وہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ایسے تذکرے، دستاویز، دیوان یا تاریخی نگارشات جن میں بلواسطہ یا بلاواسطہ حافظ کا ذکر آیا ہے، یا اس کے اشعار کو بطورِ تمثیل پیش کیا گیا ہے۔ ایسے مآخذ عام طور سے نویں صدی ہجری تک ہی ملتے ہیں۔ اگرچہ اِن میں بعض اطلاعات ایسی بھی ہیں جن کی اصالت اور صحت پر کم تر شک اور تردید کی گنجائش ہے۔ تاہم کاتبوں کی تحریف ہمارے لیے موجب زحمت بنی ہے۔ بعض اوقات تو شعر میں معمولی سی تحریف سے صورت اور معانی میں عجیب تبدیلی رونما ہو جاتی ہے اور قاری کے لیے ایک مشکل درپیش آتی ہے۔

دوسری قسم کے مآخذ میں مستند اور معتبر تذکرے اور تاریخیں شامل ہیں جو عام طور پر قدما اور متوسطین کے حالات میں تحقیق و تدقیق کی غرض سے محققوں ں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذرائع پہلی قسم کے مآخذ کے مقابلہ میں اجمالی طور پر زیادہ مفصل اور واضح ہیں۔ اگرچہ حافظ یا کسی دوسرے خاص شاعر، عالم یا دانش مند کے بارے میں سیر حاصل تفاصیل میسّر نہ ہوں۔

پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں شبلی نعمانی کے زیرِ نظر مآخذ و منابع کو دہرایا ہے۔ اِن میں حبیب السیر، تذکرۂ مے خانہ، تذکرہ الشعراء، بہارستان، نفحات الانس، آتش کدہ آذر۔ ہفت اقلیم اور مجمع الفصحا شامل ہیں۔ البتہ اپنی کتاب رشتہ تحریر میں لاتے وقت تذکرہ میخانہ پروفیسر براؤن کی دسترس میں نہ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں یہ کتاب لاہور کالج میں عربی کے پروفیسر محمد شفیع نے اُردو زبان میں

طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ اسی زمانہ میں ایران کی مردم خیز زمین سے کئی مشہور معروف دانش منداور محقق پیدا ہوئے۔ جن کی ادبی اور علمی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں ہیں، مثال کے طور پر دیوان حافظ کو ہی لے لیجیے۔ اس کے صحیح ترین اور معتبر ترین نسخے کی تدوین اور طباعت کے لیے ذاتی اور سرکاری طور پر سالہا سال کام ہوتا رہا۔ اور بڑی خاصی رقم خرچ کی گئی۔ دُنیا کے تمام کتاب خانوں میں موجود قلمی نسخوں کی فوٹو کاپی حاصل کی گئی۔ تمام دستیاب نادر تذکروں اور تاریخوں کو سامنے رکھا گیا اور پھر کہیں جا کر وزارت فرہنگ و تعلیم ایران نے اپنے وقت کے دو مشہور عالموں یعنی میرزا قر دینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کی رہنمائی میں ایک مستند اور معتبر دیوان حافظ چھپوایا۔ جو شخص اس نسخہ کی تدوین میں کاوشوں کی تفصیل سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اسے اس کا مقدمہ پڑھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ بیسوں نسخے ہیں جو ذاتی ذوق اور کاوش کے نتیجے میں چھاپے گئے اور اب آسانی سے دستیاب ہیں۔

دورِ حاضر میں حافظ شناسوں کی تعداد ایران میں اور ایران سے باہر خاصی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حافظ پر اِن میں سے کئی لوگوں کی نگارشات اہم بھی ہیں اور دل چسپ بھی۔ ہم اس کتاب میں اِن تمام مآخذوں کا ذکر کریں گئے جو دور معاصر کی تلاش سے تعلق رکھتے ہیں اور حافظ پر مبسوط کام کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتے ہیں۔

سب سے پہلے حسین پژمان کے ۱۳۱۵ ہجری میں مرتبہ دیوان حافظ کا ذکر ضروری ہے ۱۳۱۸ ہجری میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا جس پر پژمان نے ۱۶۷ صفحات کا سیر حاصل اور سود مند مقدمہ لکھا۔ اس میں کئی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا۔ اور ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے حافظ کی زندگی پر کسی حد تک مزید روشنی پڑتی ہے۔ اگر چہ مقدمہ ایک جامع کاوش کا نتیجہ ہے تاہم اس میں درج اطلاعات حافظ کی خارجی زندگی سے ہی متعلق ہیں۔ داخلی موضوعات یعنی

معاصرین کی تحقیق

تیسری قسم کے مآخذ جو دراصل تحقیق کے نام سے پکارے جائیں تو بہتر ہے۔ دورِ جدید کے ایرانی اور غیر ایرانی بالخصوص یورپی محققوں کی نگارشات ہیں۔ اِن کی روش عام طور پر سے یہ رہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو تذکروں، تاریخوں اور دیگر قدیم مآخذوں میں دماغ سوز تحقیق کی جائے اور مفروضات اور قیاسات سے دور رہ کر اصل واقعات کی روشنی میں کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس کاوش کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ بہت سارے مآخذوں کو گوشہ گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لایا گیا۔ اور دوسرے یہ کہ سابقہ تذکروں اور تاریخوں میں مندرج بعض اہم واقعات کی تصدیق و تردید ہونے میں کم و بیش مدد ملی ہے اور بہت سارے تاریخی واقعات کے چہروں سے ابہام اور مغایرت کا حجاب اُٹھ گیا ہے۔

بڑے اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ دورِ جدید میں رضا شاہ کبیر نے ایران کی اقتصادی، سماجی اور تمدنی رگوں میں نیا خون دوڑایا اور ترقی کی نئی راہیں لوگوں کے لیے کھول دیں۔ ایران میں وطنیت کا جذبہ ایک بار شدومد سے اُبھرا، اور ایرانیوں نے منجملہ دیگر مساعی کے، ایرانی ادب اور اپنے شاعروں اور اہلِ دانش کو بہتر طریقے سے اپنی ملّت میں روشناس کرانے کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ جدید سائنسی انکشافات اور تکنیکی تسہیلات کی مدد سے ایران کے مدفون علمی اور ادبی خزانون کو بازیاب کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ یورپ کے زیرِ اثر علمی تحقیق نے اپنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

گذشتہ برسوں میں یعنی محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں غیر معمولی رفتار سے کتابیں چھاپنے اور نئی کتابیں لکھے کا کام جاری رہا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ چھپائی میں سرعت کے علاوہ نفاست کو بھی ملحوظ نظر رکھا جانے لگا اور صحت عبارت کی

استاد سعید نفیسی نے اشعار و احوال حافظ کے عنوان سے ایک کتاب میں غزلیات پر ان کی اصالت اور انتساب کے لحاظ سے بحث کی ہے۔ چوں کہ استاد نفیسی نے دیوان کا گہرا اور ایرانی تمدن کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اس لیے اِن کا مطالعہ بہت دل چسپ اور مفید ہے۔

عبد الرحیم خلخالی نے حافظ نامہ کے عنوان سے آثار و احوال حافظ پر ایک رسالہ لکھا ہے جس میں کچھ نئے اور تازہ مطالب زیر بحث لائے گئے ہیں۔

میرے بزرگوار استاد مرحوم ڈاکٹر معین نے حافظ شیرین سخن کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں حافظ کے سوانح کے علاوہ اُس کے افکار و عقائد پر عالمانہ بحث ہے۔ محمد علی بامداد نے الہامات خواجہ یا حافظ شناسی کے نام سے اپنی کتاب میں حافظ کے مسلک اور طریقہ پر روشنی ڈالی ہے۔

مجید یکتائی نے ۱۳۲۸ ہجری میں تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ دیوان حافظ کو چھپوایا۔ مقدمہ میں حافظ سے منسوب اشعار کی صحت وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے مصحح نے بڑی جستجو کی ہے کہ حافظ کی زندگی سے متعلق نئے خیالات اور نا معلوم واقعات کو سامنے لایا جائے۔ لیکن بعض اوقات چوں کہ اُنھوں نے اپنے کام میں بہت سی نئی بحثیں چھیڑی ہیں اس لیے بہت سی باتیں بے دلیل اور بے ثبوت بن کر رہ گئی ہیں۔

آخر میں علی داشتی کی کتاب نقشی از حافظ کا ذکر کرنا ضروری ہوگا۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں یعنی تین عنوانوں حافظ در عالم لفظ حافظ در جہان اندیشہ'' اور '' ہنر حافظ'' کے تحت بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور موضوعات کو ضمناً زیر بحث لایا گیا ہے۔

جدید زمانے میں شبلی نعمانی نے شعر العجم '' میں حافظ کی زندگی اور اس کی شاعری پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ شبلی کا اپنا مخصوص ناقدانہ انداز ہے۔

معنویات، افکار و عقائد، مذہب، تصوف وغیرہ پر کمتر بل کہ بہت سرسری توجہ دی گئی ہے بہ ہر حال یہ مقدمہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ایڈیشن کے متن کو بھی بڑی کاوش اور تحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

مرحوم ڈاکٹر قاسم غنی نے حافظ کے زمانے اور تاریخ پر سب سے اہم تحقیقی کام انجام دیا ہے اور اس کی کتاب تاریخ عصر حافظ کے عنوان سے دو جلدوں میں تہران میں چھپ چکی ہے۔ اُنھوں نے فارسی ادب کے دور حاضر کے ایک زبردست محقق یعنی علامہ محمد قزوینی کے ساتھ مل کر بڑی عرق ریزی کے بعد دیوان حافظ کو نہایت عمدہ مقدمہ کے ساتھ چھاپا ہے، یہ مقدمہ اور تاریخ عصر حافظ پر علامہ قزوینی کا مقدمہ میرے نزدیک حافظ کی شاعری اور منجملہ امور پر نہایت قابلِ قدر مقالہ ہے۔

ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے درسی از دیوان حافظ کے نام سے دو حصوں پر مشتمل ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے پہلا حصہ نظام تربیت اور تعلیم'' موضوع کے تحت حافظ کے صفات، سلوک۔کسب علم وغیرہ بارہ فصلوں پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ''معارف معنوی'' کے عنوان سے مصطلحات حافظ پر بحث ہے۔اس دانش منداور صاحب ذوق ایرانی نے پروفیسر براؤن کی ایران کی ادبی تاریخ ایک حصہ کو ''از سعدی تا جامی'' کے عنوان سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس پر نہایت سفید اور قابلِ قدر حاشیے بھی لکھے۔

سیف پور فاطمی نے شرح حال لسان الغیب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں حافظ کی سوانح حیات، نقد آثار و تحلیل اشعار پر کام کیا گیا ہے۔کتاب کا دیباچہ رضا زادہ شفق نے لکھا ہے۔جس کا موضوع ''موازنہ حافظ گوئٹے'' ہے۔ اختصار کے باوجود یہ کتاب بڑی مفید اور تاریخی مواد سے بھرپور ہے۔اور حافظ کے شرح حال پر مزید تحقیق کے لیے اچھی رہنمائی کرسکتی ہے۔

اِن کے علاوہ اور بھی کئی انگریزی تراجم موجود ہیں جن کے مقدموں میں مفید مطالب لائے گئے ہیں۔ اِن کی فہرست اختصار کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

1. A Specimen of Persian Poetry by John Richardson, London 1774

2.Selected odes from the Persian poet Hafiz by John Nott , London 1787

3. The Song of the Reed and other pieces by E.H Palmer 1877

4. Versions from Hafiz,an Essay in Persian metre by Walter Leaf 1898

5. The peoms of Shamsuddin Mohammad Hafiz Shiraz by John Payne.

جہاں تک پروفیسر براؤن کی تحقیق کا تعلق ہے وہ خود معترف ہے کہ اس کے ماخذ کی بنیاد شبلی کا شعرالعجم ہے بہرصورت حافظ پراس کی تحقیق قابلِ ستائش ہے۔ انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی، لاطینی اور ترکی زبانوں میں بھی حافظ پر بڑا کام کیا گیا ہے۔ یورپ کی کئی زبانوں میں حافظؔ کی غزلیات کا ترجمہ ہوا ہے۔ اور اِن پر تبصرے چھپے ہیں۔

(یہ تفصیلات ہاشم رضی کے چھاپے ہوئے دیوان حافظ ص، ۳۸۔۳۹ سے اخز کی گئی ہے)

دیوان حافظؔ کے قدیم قلمی نسخہ جات

حافظؔ کا دیوان تو فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً ہر شخص کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ ایران میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ملے گا جس میں دیوان

پروفیسر براؤن نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اُنھوں نے حافظ کے بیشتر حالات ''شعرالعجم'' سے ہی لیے ہیں۔

یہ تو ایرانی (بہ استثناسی شبلی) محققوں اور ناقدوں کا ذکر تھا۔ البتہ یورپ میں کئی قابلِ قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں حافظ کی شاعری کے داخلی اور خارج عناصر کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم قارئین کی سہولت کے لیے ذیل میں یورپ میں حافظ پر کام کرنے والے محققوں کی فہرست معہ اضافات درج کریں گے، جن میں حافظ کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

انگریزی زبان میں حافظ پر تحقیق کرنے والوں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔ مس جرٹرڈ وبل (MIss Gertrude Bell) نے حافظ کی منتخب غزلوں کا انگریزی ترجمہ ایک مفصل اور جامعہ مقدمہ کے ساتھ لندن میں چھاپا۔ اس فاضل خاتون کی حافظ پر قابلِ قدر تحقیق اور تدقیق کی پروفیسر براؤن نے بڑی تعریف کی ہے۔ مس بل نے منجلہ توضیحات، حافظ کا اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے مس بل کے ترجمہ سے بڑا استفادہ کیا ہے اور اُس کے متوازن اور پُرمغز مقدمہ کی بہت تعریف کی ہے۔

دوسری مفید تحریر جس میں حافظ کے احوال وآثار پر قابلِ قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سر گور اوزلی (Sir Gore Oseley) کی ہے۔ اس میں حافظ سے متعلق کئی حکایات کو بھی درج کیا گیا ہے۔ اور پروفیسر براؤن نے حافظ کا ذکر کرتے وقت اس کتاب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔

ہرمن بکنل (Hernann Bicknell) نے بھی حافظ کی کچھ منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس کے احوال کو دل چسپ انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔

معتبر ترین دیوان مرتب کر کے چھاپا جائے۔ کہ چناں چہ اب تک ایسے چار دیوان چھپ چکے ہیں۔

دیوان حافظ بکوشش عبدالرحیم خلخالی بکوشش حسین پژمان، بکوشش ڈاکٹر قاسم غنی و محمد قزوینی اور بکوشش ہاشم رضی۔

بہر حال دیوان حافظ کے غیر معتبر یا معتبر، لیکن قدیم ترین نسخوں کو تاریخی ترتیب سے جاننا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، یہ ترتیب اس طرح ہے۔

نشانی قلمی نسخہ	سال کتابت
۱۔ نسخہ عبدالرحیم خلخالی۔ تہران	۸۶۷ھ ہجری
۲۔ نسخہ بادلین۔ آکسفورڈ، انگلستان	۹۶۳ھ ہجری
۳۔ نسخہ کتاب خانہ خصوصی مسٹر چسٹر بیٹی۔ انگلستان	۸۵۳ھ ہجری
۴۔ نسخہ مجلس شوراہی ملّی۔ تہران	۸۵۲ھ ہجری
۵۔ نسخہ برٹش میوزیم۔ لندن	۸۵۵ھ ہجری
۶۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ ملّی پیرس۔ فرانس	۸۵۷ھ ہجری
۷۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ ملی۔ تہران	۸۵۸ھ ہجری
۸۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ لیدن ہالینڈ	۸۹۴ھ ہجری
۹۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ ملّی ویانا آسٹریا	۹۰۰ھ ہجری
۱۰۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ شخصی، سید نصراللہ تقوی، تہران	۹۰۵ھ ہجری
۱۱۔ نسخہ دیوان حافظ مدرسہ سالار۔ تہران	۹۱۰ھ ہجری
۱۲۔ نسخہ دیوان حافظؔ السنہ شرقیہ، پیٹرز برگ۔ روس	۹۳۹ھ ہجری
۱۳۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ برلن۔ جرمنی	۹۴۲ھ ہجری
۱۴۔ نسخہ دیوان حافظؔ۔ کیمرج یونی ورسٹی انگلستان	۹۷۳ھ ہجری

حافظ موجود نہ ہو۔ اس مقبولیت کے باوجود امر یقینی ہے کہ کوئی بھی ایک نسخہ دوسرے نسخہ سے مکمل مطابقت نہیں رکھتا۔ یعنی یہ کہ کچھ نہ کچھ اختلاف مابین تو ہے۔ یا تو ایک نسخہ میں کوئی اضافی غزل ہوگی جس کو حافظ سے منسوب کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ اصل سے خذف کی گئی ہو۔ تحریف تو فارسی دیوان میں عام طور پر ہوئی ہے۔ اس لیے یہ بتانا مشکل ہے اور غیر یقینی بھی کہ کونسا نسخہ ہر لحاظ سے معتبر اور مستند ہے۔ بعض اوقات تو اِن میں اختلافات کی بنا پر ہمیں بڑی زحمت سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ دیوان حافظ میں جتنی تحریف یا بقول ناسخاں ''اصلاح'' ہوئی ہے وہ حد سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اصل شعر	بعد تحریف
(۱) خوش وقت بوریا و گدائی و خواب امن کاین عیش نیست و خور اورنگ خسروی	خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن کاین عیش نیست در خور اورنگ خسروی
(۲) دانی کہ چنگ و دعود چہ تقریر میکنند پنہاں خورید بادہ کہ تعزیز میکنند	دانی کہ چنگ دعود چہ تقریر میکنند پنہاں کنید بادہ کہ تکفیر میکنند
(۳) یار دلدار من ارقلب بدینسان شکند ببروز در بجانداری خود پاشہش	یارالدار من ارقلب بدینسان شکند ببروز و دبسر داری خود پادشہش
(۴) زہد رندان نوآموختہ راہی بدہیست منکہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم	زہد رندان نوآموختہ راہی بدنیست منکہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم

گزشتہ چند برسوں سے ایران میں بڑی کاوش ہو رہی ہے کہ صحیح ترین اور

نے ایسے ایک مجموعہ سے غزلیات حافظ کا بقول اُن کے قدیم ترین نسخہ دستیاب کر کے ۔ ۱۳۴۸ ہجری شمسی مطابق ۱۹۶۹ء میلادی تہران میں چھپوایا۔ چھپا ہوا دیوان راقم الحروف کی نظروں سے گذرا ہے اور کشمیر یونی ورسٹی کے مرکزی کتاب خانہ میں موجود ہے۔ ڈاکٹر خانلری کا قول ہے کہ یہ نسخہ خلخالی کے نسخہ سے دس سال پہلے لکھا جا چکا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ برٹش میوزیم میں تحت شمارہ ۲۶۱/۲۷ موجود ہے اور ریو کے فہرست کتاب ہائے فارسی (a catalogue of Persian books) جلد دوم کے صفحہ ۸۶۸ پر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مجموعہ جمادی الاول ۸۱۳ ہجری سے لے کر جمادی الثانی ۸۱۴ ہجری کے درمیان امیر تیمور کے پوتے اسکندر بن عمر شیخ کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کے دو کاتب ہیں ۔ ایک محمد حلوائی اور دوسرا ناصرالکاتب، شاہزادہ اسکندر اس زمانے میں اپنے چچا شاہرخ کی طرف سے فارس پر حکومت کرتا تھا۔ ۸۱۷ ہجری میں سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے نتیجا میں اس نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

(غزلہای حافظ شیرازی بکوشش دکتر پرویز ناتل خانلری صفحہ ۹)

یہ سطور تحریر کرتے وقت موئف کا اطلاع ملی ہے کہ دیوان حافظ کا ایک اور قلمی نسخہ ہندوستان میں گورکھپور کے مقام پر حاشم علی سبز پوش کے کتاب خانہ میں موجود ہے جس کی کتابت ۸۶۴ ہجری کو ہوئی بتلائی جاتی ہے۔ اس نسخہ کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر نذیر احمد اور ایران کے ایک دانش مند جلالی نائینی نے باہمی ہمکاری سے تہران میں چھاپا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کا دعویٰ ہے کہ یہ دیوان حافظ کا قدیم ترین نسخہ ہے جو ہماری دسترس میں ہے۔

دیوان حافظ کی شرحیں

دیوان حافظ کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں یہ نہ صرف فارسی زبان میں ہیں بل کہ انگریزی ترکی اور اُردو کے علاوہ غالباً کئی یورپی زبانوں میں لکھی جا چکی

۱۵۔ نسخہ دیوان حافظؔ ۔ کتاب خانہ ملّی قاہرہ۔ مصر سنہ ۹۷۴ ہجری

۱۶۔ نسخہ دیوان حافظؔ کتاب خانہ ملک تہران ۹۸۶ ہجری

۱۷۔ نسخہ دیوان حافظ انڈیا آفس لائبریری۔ لندن سنہ ۱۰۰۴ ہجری

اس فہرست میں قدیم ترین نسخہ عبد الرحیم خلخالی کا ہے جس کی رو سے اُنھوں نے ۱۹۲۷ء میں ایک دیوان چھاپا تھا۔ یہ نادر نسخہ نستعلیق خط میں غزلیات کا مکمل دیوان ہے البتہ اس میں نہ کوئی مقدمہ ہے اور نہ حافظؔ کے قطعات یا رباعیات، غزلوں کی تعداد چار سو نوے ہے تاریخ کتابت نسخہ کے آخر میں صریح عبارت میں درج ہوئی ہے۔ کاتب کی عبارت یوں ہے۔

''تم الدیوان اوّایل شہر جمادی الاول لسنہ ربع عشرین وثمانماۃ الہجریہ''۔ یعنی ۸۶۷ ہجری

گویا حافظؔ کی وفات کے صرف پینتیس سال بعد اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے

خلخاؔلی کا قول ہے کہ اب تک اس سے قدیم تر نسخہ نہ تو ایران میں ہی دستیاب ہوسکا اور نہ ایران سے باہر کسی ذاتی یا سرکاری کتاب خانہ میں البتہ بقول علامہ قزوینی اس میں بھی کئی غلطیاں ہیں جو چھپے ہوئے دیوان میں برقرار رکھی گئی ہیں۔ اور انھیں درست کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

یہ اِن قدیم نسخوں کی فہرست ہے جو ہماری دسترس میں ہیں۔ گیارہویں صدی ہجری سے آج تک بہت سے قلمی نسخے لکھے گئے ہیں۔ اُن کی تعداد معقول ہے اور وہ ایران میں یا ایران سے باہر کتاب خانوں میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں قدیم ایرانی ناسخوں اور کاتبوں کے طریقۂ کتابت کے مطابق کئی مجموعے ملتے ہیں۔ جن کے حاشیوں پر یا تو مکمل دیوان حافظ کی غزلیات درج کی گئی ہیں۔ یا اس کی منتخب غزلیں ہیں۔ تہران یونی ورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر خانلری

میں دوسری بار شیراز میں چھپا۔ شیراز میں چھپے ہوئے نسخہ پر اُس وقت کے عارف و عالم آقا میرزا احمد عبدالحی مرتضوی تبریزی نے مقدمہ لکھا۔ شاہ سلطان صفوی کے معاصر سید قطب الدین محمد تبریزی (متوفی) سال ۱۱۷۰ھ ہجری نے اپنی کتاب فصل الخطاب میں شاہ محمد دارابی کے احوال درج کیے ہیں۔ اس کا قول ہے کہ دارابی دارالعلم شیراز میں ایک فاضل اُستاد تھا اور اس نے معراج الکمال کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا لیکن اس رسالہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر موئف شاہ عباس صفوی دوم کا ہم عصر تھا۔ اس کی زندگی فارس میں دارابجرد کے مقام پر بسر ہوئی اور پھر شیراز آیا۔ کسب علم میں مصروف رہا ۱۰۲۴ھ ہجری کے آس پاس وہ احمد آباد اور گجرات میں تھا۔

رسالہ لطفیہ غیبیہ میں محمد دارابی نے اپنے ہم عصروں کے حافظؔ پر بعض اعتراض پر بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں بعض مشکل اشعار کی توضیح بھی کی ہے دارابیؔ نے اس رسالہ میں تین شدید اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو حافظ کے معترضین نے اس کی شاعری پر وارد کیے ہیں۔ اعتراضات یوں ہیں

(۱) حافظ کے بعض ابیات کے معنی معلوم نہیں ہوتے اگر اِن کے کچھ معنی ہوں تو اِن کی فہم بڑی مشکل ہے مثلاً

خرقہ از سر بدر آورد و بشکر از بسوخت[۱] ماجرا کم کن و باز آ کہ مرا مردم چشم

(۲) حافظ کے بعض اشعار شرع کے خلاف ہیں۔ اِن میں ہوا و ہوس کے بغیر اور کوئی پہلو نہیں مثلاً

بود آشفتہ تر از موی فرخ دل من در ھوای روی فرخ

یا

---

[۱] اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے استاد سعید نفیسی نے ''در مکتب استاد'' میں لکھا ہے کہ ایک پائینی رتبہ کا صوفی بالا ترتبہ کے صوفی کے سامنے اپنا خرقہ اُتار دیتا تھا۔

۱۸۵۲ء میلادی میں براک ہاز (Brockhaus) نے لائپزگ (Leipizig) میں چھاپے ہوئے دیوان حافظؔ کی ایسی غزلوں پر شرح بھی ملحق کر دی ۱۸۷۰ء میلادی میں سودی کی شرح کامل معہ متن ایک ترکی زبان کی شرح کے ضمیمہ کے طور پر استنبول میں ں چھپی۔ انگریزی زبان جاننے والے اگر سودؔی کی طرز نگارش سے آگاہ ہونا چاہیں تو ندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

1 Twelve Odes of Hafiz done literally into English together with the corresponding portions of the Turkish commenttary of Sudi W.H.Lowe, Cambridge 1887.

2. English Translation of Diwan of Hafiz. Col . H Wilberforke Clerk

سودؔی نے اپنی مشہور شرح کے ساتھ حافظؔ کی غزلیات کو بھی درج کیا ہے۔ براؤن کا قول ہے کہ سودی کی درج شدہ غزلیں بہت زیادہ قابلِ اعتبار اور قابلِ قبول ہیں اور بعد کے نسّاخ اکثر اسی سے نقل کرتے رہے ہیں۔ علامہ قزوینی نے مقدمہ دیوان حافظ میں اعتراف کیا ہے کہ اس نے سودی کی شرح کے ساتھ ملحق غزلیاتِ حافظ سے استفادہ کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے سودی کی شرح کو سب سے بہتر اور مفید بتایا ہے۔ اس لحاظ سے کہ سودی نے ہر طرح کی مجازی اور تمثیلی تفسیر میں افراط و تفریط سے اجتناب کیا ہے اور مشکل ابیات و کلمات کی خیالی تاویلات کی بے ہودہ کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ سودی نے کل ملا کر ۵۷۳ غزلوں ۴۲ قطعوں ۶ مثنویوں ۴ قصیدوں اور ایک مخمس کو دیوان میں جمع کر کے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

گیارہویں صدی ہجری میں محمد بن دارابی نے لطیفہ غیبیہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ ۱۲۷ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ۱۳۰۴ ہجری میں چھپا اور ۱۳۱۹ ہجری

کام دیتے ہیں ایران کے مختلف ادبی اور علمی رسالوں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں کچھ اور کتابیں حافظ پر لکھی جا چکی ہیں۔ اور ہم نے پہلے بھی اُن کا ذکر کیا ہے۔

فارسی شرحوں میں کشف الاسرار کے نام سے محمد افضل اللہ آبادی کی شرح ہے۔ ایک اور شرح سحر الفراسہ نام کی عبداللہ خلیفہ حی بن عبدالحق نے لکھی ہے اس کی تلخیص بنام حلاصتہ البحر بھی ہے۔ فارسی میں ایک اور شرح محمد ابراہیم بن محمد سعید کی ہے جس میں دشوار اشعار کی طرف زیادہ ترجہ دی گئی ہے۔

حال ہی میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ شیراز میں پہلوی یونی ورسٹی کے ایک حافظ شناس پروفیسر مسعود فرزاد نے اس شاعر پر کئی جلدوں میں تحقیقی کام چھاپنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ غالباً اس کی تحقیق کی کچھ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ جن میں ہماری اطلاع کے مطابق حافظ کی شاعری اور فن کے موضوعات پر بحث ہے البتہ اس سلسلہ کی کوئی کتاب ابھی میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

ہزار آفرین بر می سُرخ باد　　　　که از روی مارنگ زردی ببرد

(۳) حافظ کے اشعار مذہب اشعری کے اصولوں کے مطابق ہیں۔ علمائے امامیہ انھیں باطل خیال کرتے ہیں مثلاً

در کوی نیکنامی مارا گذر ندادند　　　　گر تو نمی پسندی تغیر وہ قضارا

یا

این جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست　　　　روزی رخش بینم و تسلیم دی کنم

اس تیسرے اعتراض کے ضمن میں استاد حکمت نے بتایا ہے کہ یورپیوں کا خیال ہے کہ عقیدہ (Fatalism) اسلام کے خاص اصولوں میں سے ہے اور یہ غلط ہے فرقہ ٔ شیعیہ کے نزدیک جبر کا عقیدہ مردود ہے اور آئمہ معصومین کے قول کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں کہ لاجبہ ولاتقریض ہل امر بین امرین''

(از سعدی و جامی صفحہ ۱۰۴)

دور معاصر میں حافظ کی غزلیات کی شرح وتفسیر کا کام جاری ہے اور اس کے اشعار کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض کیا جارہا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت تحقیق و تدقیق کے کام کو انجام دینے کی بڑی سہولتیں میسّر ہیں۔ دُنیا کے کسی بھی کتاب خانے میں موجود کسی بھی قلمی نسخہ کی فوٹو کاپی قلیل وقت میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر میں سب سے پہلے استاد علی اصغر حکمت کی تحقیق اور درسی از دیوان حافظ قابلِ ذکر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر معین کی کتاب ''حافظ شیرین سخن'' باوجود اختصار بڑا عالمانہ مطالعہ ہے یہ کتاب اب نایاب ہے۔

مرحوم استاد سعید نفیسی کی کتاب...... احوال وآثار حافظ اور سیف پور فاطمی کی شرح حال لسان الغیب دونوں شرح کے لحاظ سے بھی مفید کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مقالات، نگارشات، تبصرہ جات جو دراصل حافظ کی شرح وتفسیر کا

راہ لی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ہدایت اور فخر الزمانی کے بیانات میں ایک اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہدایت نے لکھا ہے کہ حافظ کے جد تویسرکان کے تھے۔اور فخر الزمانی کہتا ہے کہ جد پدر بزرگ کوپای اصفہان کے تھے اور ادھر براؤن نے شبلی سے نقل قول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حافظ کے والد اصفہان سے مہاجرت کر کے شیراز آئے۔ اِن متضاد بیانات کے پیش نظر یہ بات یقین سے کہی نہیں جا سکتی کہ آیا حافظ کے والد ہجرت کر کے شیراز آئے تھے یا اُن کے اجداد (اصفہان سے یا تویسرگان سے)

جو لوگ حافظ کے والد کو تویسرگان کا بتاتے ہیں اُنھوں نے تو اس کا نام بہاوالدین لکھا ہے۔ اور جو لوگ حافظ کے خاندان کا اصفہان کا مہاجر خاندان خیال کرتے ہیں۔ وہ کمال الدین بتاتے ہیں۔ صاحب تذکرہ میخانہ کا قول ہے کہ حافظ کی والدہ کازرون (فارس) کی تھیں اور حافظ کا مکان شیراز میں محلّہ دروازہ کازرون میں تھا۔ البتہ کئی دیگر روایتوں کے مطابق اِن کا گھر دروازہ کازرون میں نہیں بل کہ محلّہ شیدان میں تھا۔

حمد اللہ مستوفی نے نزہتہ القلوب میں لکھا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں شیراز میں ۱۷ یا ۱۹ محلے تھے۔ شیراز کے ایک نیک مرد اور عادل حکمران کریم خان زند نے شہر کو بارہ محلوں میں تقسیم کیا تھا اور یہ ترتیب اب بھی باقی ہے۔ یعنی محلّہ اسحاق بیگ محلّہ بازار سیر باغ۔ محلّہ بالا گذر، محلّہ درشاہ، محلّہ میدان شاہ، محلّہ دروازہ کازرون، محلّہ مرغ، محلّہ سنگ، محلّہ سنگ سیاہ، محلّہ لب آب، محلّہ گلدستہ، محلّہ درشیخ، محلّہ سنگ سیاہ کا نام اس وجہ سے پڑا کیوں کہ وہاں علم نحو کے مشہور عالم حکیم سیبویہ کی قبر پر سیاہ رنگ کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ شیراز میں یہودیوں کا بھی ایک محلّہ ہے جس کو محلّہ کلیمیاں کہتے ہیں۔

اکثر تذکرہ نویس اتفاق کرتے ہیں کہ حافظ کے والد ماجد شیراز میں

تیسرا باب
حافظؔ کی زندگی کے حالات

میں بڑی زوردار دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ملاحظہ ہوں۔

(۱) اگر شیخ ابواسحاق اور حافظؔ کے درمیاں دوستی کے آغاز کی تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ اُن کے روابطہ ۷۴۵ھ ہجری سے شروع ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے حافظؔ کی عمر اُس وقت نو برس معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نو برس کے لڑکے کی دوستی شاہ ابواسحاق جیسے باوقار اور سخن فہم بادشاہ کے ساتھ ہونی ممکن نہیں۔ ایس دوستی بعید از قیاس ہے۔

(۲) حافظ نے حاجی قوام الدین کی تعریف میں یہ مشہور شعر کہا ہے۔ اگر چہ اس میں تردید کی گنجائش باقی ہے۔

دریای اخضر فلک و کشتئی ہلال　　　ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

حاجی قوام ۷۴۵ھ ہجری میں فوت ہوا تھا۔ اور خواجہ حافظؔ نے اس کی وفات کا مادہ تاریخ بھی نکالا ہے۔ اس لیے اگر فرض کریں کہ حافظ کا سال ولادت ۷۳۶ھ ہجری ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاجی قوام الدین کی تعریف میں کہے گئے شعر والی غزل کو حافظ نے نو سال کی عمر ہی میں کہا تھا۔ جو لوگ اس غزل کے معنی اس کی معنوی خوبی اور پختگی سے آگاہ ہیں وہ کبھی قبول نہیں کریں گے کہ نو سال کا لڑکا اتنی پختہ اور شاہکار غزل کہہ سکتا ہے اور خاص کر یہ شعر جو فارسی کا لافانی شعر مانا گیا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چوں کہ اس مشہور غزل کا ذکر آیا ہے اس لیے ہم اصل موضوع سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ کر اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کریں گے۔
عبدالحسین ہژیر کی کتاب حافظ تشریح میں ایک

تجارت کرتے تھے اور ہمیشہ صاحب مُکنت تھے۔ کچھ وقت بعد اِن کی وفات شیراز میں ہوئی۔ بہاوالدین کی موت کے بعد اِن کے گھر کے حالات خراب ہو گئے۔ ایک بیوہ اور ایک کم سن لڑکا اس کے وارث رہ گئے۔ لیکن صاحب میخانہ کا قول ہے کہ بہاوالدین کے تین لڑکے تھے جن میں دو شیراز چھوڑ کر کسب معاش کے لیے کسی دوسری جگہ چلے گئے تھے اور سب سے چھوٹا لڑکا شمس الدین محمد شیرازی شیراز میں ہی اپنی والدہ کے پاس رہا اور ماں بیٹے دونوں تنگ دستی، اور بے نوائی میں بسر اوقات کرتے رہے۔

۲۔ ولادت:۔ چوں کہ حافظ کی زندگی کے حالات ابھی تک کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکے ہیں اس لیے دوسری باتوں کی طرح اِن کی تاریخ ولادت کے بارے میں بھی تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں۔

تذکرۂ میخانہ میں بتایا گیا ہے کہ حافظ نے ۶۵ برس کی عمر میں رخت سفر باندھا۔ اگر اس کے سال وفات کو ۷۹۱ھ فرض کریں تو اس کی ولادت ۷۲۶ھ ہجری ہونی چاہے۔ اس قول کی تصدیق چند شواہد کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ شاہ شجاع ۷۶۶ھ ہجری میں کوچان سے واپس شیراز آیا تو کچھ وجوہات کی بنا پر اُس نے حافظ کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا۔ حافظ نے آخر کار سفر کا ارادہ کیا اور ذیل کے مطلع کی غزل کہی۔

چل سال بیش رفت کہ من لاف می زنم
کز چاکران پیر مغان کمترین منم

شاہ شجاع کی شیراز میں مراجعت کا سال (۷۶۶ھ ہجری) مدنظر رکھ کر اس میں سے چالیس کم کیے جائیں تو سال تولد ۷۲۶ھ ہجری دریافت ہوتا ہے۔ لیکن کچھ تذکرنویسوں اور محققوں کا خیال ہے کہ حافظ کی وفات کے وقت اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اس طرح اس کی ولادت ۷۴۵ھ ہجری ہونی چاہیے۔ اس قول کی تردید

عقل سلیم کو قبول نہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اُستاد خانلری کے شائع کردہ دیوان میں زیر بحث غزل میں یہ شعر نہیں ہے اور غنی کے دیوان میں مقطع کے بعد آیا ہے جو خواجہ حافظ کا طریقہ نہیں

(۳) حافظ نے قوام الدین محمد صاحب عیار (وزیر) کی مدح میں یہ غزل کہی ہے۔

بحُسن د خلق و وفا کسی بہ یار ما نرسد — کہ گردشان بہوای دیار ما نرسد

اس میں ایک شعر یوں ہے۔

دریغ قافلۂ عمر کا پخنان رفتند — کہ گردشان بہوای دیار ما نرسد

اگر فرض کریں کہ یہ عمدہ اور متین غزل محمود صاحب عیار کی زندگی کے اخری برسوں یعنی ۷۶۴ھ ہجری میں لکھی گئی ہو تب بھی اس وقت حافظ کی عمر انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ انیس برس کا جوان اول تو اس قدر متین اور پختہ غزل کہہ نہیں سکتا، اور دوم اگر کہہ بھی سکے لیکن عمر گزشتہ پر تاٴسف کیوں کرے گا۔ جب کہ ابھی اُس نے بہ مشکل شباب میں قدم رکھا ہو۔

(۴) حافظ نے اپنی غزلوں میں بار بار پیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دلا چو پیر شدی حن و نازکی مفروش — کہ این معاملہ با عالم شباب ردد

....

گرچہ پیرم تو بشی تنگ در آغوشم گیر — تا سحر گہہ ز کنار تو جوان برخیزم

....

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون آی — رندی د ہوسنا کی در عہد شباب اولیٰ

ظاہر ہے کہ جو شخص چھیالس برس کی عمر پا چکا ہو، اُس نے پیری کا عہد تو

حکایت درج ہے۔ حافظ کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے موئف نے ضمناً حافظ کی غزلوں میں تحریف اور دخالت پر زوردار بحث کی ہے اور دیوان حافظ میں پست اشعار کاتبوں، ناسخوں اور غیر ذمہ دار شایقوں کی دست اندازی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس غزل پر بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے کہ ایک بار میں چاندنی رات میں اصفہان کے ایک کوچہ سے جا رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک اندھا آدمی ملا جو بڑے سوز وگداز سے حافظ کی یہی غزل نہایت پُرسوز لے میں گا رہا تھا۔ اس چاندنی رات میں مجھے اس بے نظیر غزل اور اس کے ساتھ اندھے کی لحن داؤدی نے عجیب کیفیت کی حالت میں ڈال دیا اور میں ازخود رفتہ ہوگیا۔ گویا میں عالم ارواح میں پہونچ گیا جہاں خالص نور عرفان اور فیض سمادی برس رہے ہوں۔ میں شیراز کے اس لافانی شاعر کی روح پُرفتوح پر ہزار درود بھیج رہا تھا کہ یکایک مُغنّی نے یہ شعر پڑھا۔

دریای اخضر فلک و کشتئ ہلال

مستند غرق نمعت حاجی توام ما

اس غیر موزوں شعر نے مجھے ایک دم جھٹکا سا دیا۔ میرے ذوق اور وجد کی کیفیت غائب ہوگئی اور وہ قدسی فیض مجھ سے رخصت ہوا۔

اس حکایت سے ناقد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بیت کاتبوں اور خوش ذوق لوگوں کی دخالت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ غزل میں اس کا ہونا کسی طرح

ایک دن نہ جانے کس طرح اس کے دل میں آئی کہ پڑھنا خدا شناسی کا موجب ہوسکتا ہے۔ چاہیے کہ اس طرف توجہ دوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کی عنایات سے بہرور ہو جاؤں!

چناں چہ بغیر استخارہ کار نیک میں ہاتھ ڈالا۔ خمیر گیری سے جو معاوضہ حاصل ہوتا اس کے چار حصے کر دیتا۔ تین حصوں کو اپنی والدہ، معلم اور اور فقیرامیں بانٹ دیتا تھا اور چوتھا حصہ اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتا۔

توفیق ایزدی نے ساتھ دیا اور اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس زمانے میں قرآن شریف حفظ کرنے والوں کا ایک خاص طبقہ تھا جو اپنے آپ کو حافظ قرآن یا فقط حافظ کہلواتا تھا۔ تاریخ ایران میں کئی حافظان قرآن کا نام آتا ہے۔ ہمیں حافظ کے کئی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی حافظ قرآن تھا مثلاً

عشقت رسد بہ فریاد گر خود بسان حافظؔ قرآن ز بر بخوانی با چاردہ روایت

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بہ قرانی کہ اندر سینہ داری

زحافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد لطائف حکمی با نکات قرآنی

دیوان حافظؔ محمد گلندام کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنی درس سے فراغت نہ ملنے کی بنا پر حافظؔ اپنی غزلوں کو اکٹھا نہ کر سکا۔ چناں چہ عبارت یوں ہے

''امّا بواسطہ محافظت درس قرآن و ملازمت بر تقویٰ و احسان.......... بہ جمع اشتات غزلیات نہ پرداخت۔''

دیکھا۔نہیں اوراس طرح کے اشعار کہنا جن میں پیری کی شکایت ہو منطقیت سے خالی ہے۔والد کی وفات کے بعد گھرانا پریشان حالی سے دوچار رہااور حافظ کی والدہ محترمہ عسرت میں گذراوقات کرتی رہیں۔صاحب تذکرہ میخانہ نے اس ابتدائی دور میں حافظ کی بے سروسامانی کا ذکر کیا ہے۔اس کا بڑا بھائی شیراز چھوڑ کر چلا گیااور ماں نے حافظ کو محلّہ کے ایک شخص کے پاس رکھا تا کہ اس کی تربیت کرے اوراس کے مستقبل کے بارے میں کوئی راستہ نکالے۔ذراسا ہوش سنبھالنے پر حافظ نے اس شخص کی روش کو پسند نہ کیا چناں چہ میخانہ میں یہ جملہ درج ہوا ہے۔خواجہ چون خود راشناخت اوضاع آن مردش خوش نیامد۔ناچار ایک نانبائی کی دوکان میں خمیر گیری کا کام کرنا پڑا۔پروفیسر براؤن نے تو یہ نہیں لکھا کہ کس عمر میں اُسے خمیر گیری کے کام پر لگایا گیا تھاالبتہ یہ کہا ہے کہ اُسے محنت شاقہ سے کسب معاش کرنا پڑا۔

''میخانہ'' کے علاوہ کئی اور تذکروں میں خمیر گیری کو واضح طور پر لکھا گیا ہے۔یہ کام آدھی رات سے لے کے صبح صادق تک کرنا پڑتا تھا۔اسی وقت سے حافظ کو سحر خیزی کی عادت پڑ گئی جس کی تصدیق اُس کے متعدد اشعار سے ہوتی ہے بل کہ سحر خیزی اس کے اشعار کا ایک ضروری عنصر بن گئی ہے۔

سحر با باد میگفتم حدیث آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

....

اسے صبا تا شبم مدو فرمای
کہ سحر گہ شگفتنم ہوس است

کہا جاتا ہے نانوائی کی دوکان کے قریب ایک مکتب تھااور اکثر آسودہ حال لوگوں کے بچے وہاں پڑھنے آتے تھے۔حافظ ہر روز اس مکتب کے سامنے سے گزرتا اور لڑکوں کو سبق پڑھتے دیکھا کرتا۔

کے طور پر ہم تک پہونچی ہیں۔ جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ

''شاعری اُس کے رتبہ سے پست ہے۔ تفسیر کلام اللہ مجید اور فرقان حمید میں بے نظیر ہے۔ علوم ظاہر و باطن میں دانش مند بصیر ہے۔''

محمد گلندام کے مقدمہ میں چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے جن کا حافظ نے مطالعہ کیا تھا اور اس ضمن میں اکثر تذکرہ نویسوں نے گلندام ہی سے نقل قول کیا ہے۔ بہر حال اگر گلندام کی دی ہوئی اطلاع کو قابل اعتبار خیال کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے فارسی ادبی کتابوں کے علاوہ اہم دینی اور تفسیری کتابون کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اِن کے علاوہ وہ عرب شاعروں کے دیوان اس کی نظر سے گزرے تھے۔ اور قوانین ادب پر مہارت بھی رکھتا تھا چناں چہ محمد گلندام کی عبارت یوں ہے۔

''............ امّا بواسطہ درس قرآن و ملازمت برتقویٰ و احسان و بحث کشاف و مفتاح و مطالع و مصباح و تحصیل قوانین ادب تجسس دواوین عرب بر جمع اشتیات غزلیات پرداحت و بہ تدوین و اثبات ابیات مشغول نشد''

دیوان حافظ کی غزلوں کے بعض اشعار سے گلندام کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کنون کہ بر کف گل جام بادہ صاف است   بہ صد ہزار زبان بُلبلش در اوصاف ست

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا گیر   چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشافست

گلندام نے جن چار کتابوں کا نام سطور بالا میں لیا ہے ہم یہاں سرسری طور اِن کے بارے میں کچھ بتائیں گئے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قرآن حفظ کرنے کی بنا پر ہی اُس نے حافظ، تخلص اختیار کیا۔ چناں چہ صاحب تذکرہ میخانہ نے اس میں ضمن میں لکھا ہے۔" یکی از اکابر بخواجہ فرمود کہ چون از سعادت قرآن وانی وفرقان خوانی مستفید ہر دو شدہ ای باید کہ تخلص خود را حافظ نمائی شمس الدین بنا بگفت آن بزرگوار تخلص خود حافظ نمود" اکابرین سے وہ کون تھا جس نے حافظ تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہمیں معلوم نہ ہوسکا حافظ کے متعدد اشعار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ خوش الحان تھا۔ صبح کے وقت قرآن پر سوز لے میں پڑتا تھا چنان چہ

زچنگ زہرہ شنیدم کہ صبحدم میگفت　　　غلام حافظ خوش لہجہ خوش آوازم

غالباً حافظ موسیقی سے بھی آشنا تھا چناں چہ اس کی غزلوں میں ایسے بہت اشعار ہیں جن میں ایرانی موسیقی سے متعلق اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ لیکن اس علم میں اس کی استعداد کس قدر تھیں ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ بطور مثال اشعار میں ساز بم۔ حجاز، عراق ٹوبانگ شیراز وغیرہ ایرانی علم موسیقی کی اصطلاحیں ہیں۔

معاشری خوش ورودی بسازمی خواہم　　　تا درد خویش بگویم بہ تار بم وزیر

....

فگندہ زمزمہ عشق ورحجاز وعراق　　　نوای بانگ غزلہای حافظ شیراز

تحصیل علم:۔

مدرسہ میں کس عمر تک حافظ تحصیل علم کرتا رہا، کسب علم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کن کن اُستادوں سے فیض حاصل کیا۔ اور قرآن کے علاوہ کن کن کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا یہ سب کچھ نا معلوم ہے البتہ کچھ باتیں حکایتوں

مجد زادہ صہبا نے اپنے اس مختصر سے غیر ذمہ دارانہ رسالہ میں لکھا ہے کہ اس کے پاس موجود ایک نسخہ میں ۱۱۱۳۸ اشعار کا ایک قطعہ آٹھویں صدی ہجری کے ایک مشہور دانش مند قاضی عضد الدین ایجی نے ادبی اور علمی مشکلات کے تفحص کے سلسلہ میں حافظؔ کو لکھ کر بھیجا تھا۔ اگر یہ درست مان لیا جائے تو اس سے دولت شاہ سمرقندی کی عبارت پر یعنی یہ کہ حافظ شاعر سے بڑھ کر دانش مند تھا۔ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال جس قطعہ کا ذکر مجد زادہ نے کیا ہے اس کا مطلع یوں ہے۔

بہ سمع اشرف فردوسی زمان برسان   کہ ای زروی تو روشن چراغ دیدہ حور

حافظؔ نے بارہا غزلوں میں ایران کے قدیم حکمران خاندانوں اساطیری و تاریخی شخصیتوں زرتشتی مذہبی تہواروں اور تمدنی عنوانوں کا نام لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ایران کی قدیم تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہوگا۔ یوں تو ہر ایرانی اپنی تاریخ تمدن کو شوق سے پڑھتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ لیکن ایک عالم اور شاعر کی حیثیت میں حافظؔ کے لیے تاریخی اطلاعات سے پوری واقفیت رکھنا لازمی تھا۔ اس نے ایران کے قدیم شاعروں کے دیوان بڑے غور سے پڑھے تھے اور ان کی طرف بعض اوقات اشارہ بھی کیا ہے۔ لینن گراڈ کے کتاب خانہ میں شاہنامہ فردوسی کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کے آخری صفحہ پر کاتب نے اپنا نام شمس الدین محمد حافظؔ شیرازی لکھا ہے گمان ہوسکتا ہے کہ یہ حافظ شیرازی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ قدما میں سے جن کا اُس نے خاصہ مطالعہ کیا تھا وہ یوں ہیں

فردوسی، نظامی، خیام، مولوی، حاقانی اور امیر خسرو

اپنے معاصرین کا کلام بھی اُن کے زیر مطالعہ تھا۔ اِن میں عماد فیقہ، سلمان ساوجی، شاہ شجاع، ہمام تبریزی، شاہ نعمت اللہ ولی، اور کمال خجندی کا نام لیا

(۱) کشاف سے مراد زمخشری کی مشہور تفسیر من حقائق التنزیل' ہے یہ کتاب پہلے یورپ اور پھر مصر میں چھپی

(۲) مفتاح سے مراد اسکاکی متوفی ۶۲۶ ہجری کی مفتاح العلوم ہے

(۳) مطالع سے گلندام کا مقصد بظاہر قاضی بیضاوی (متوفی ۶۷۵ ہجری) کی کتاب مطالع الانظار تی شرح طوالع الانور ہے۔ یا قاضی اموی (متوفی ۶۶۱) کی مطالع الانور ہے یا عبدلرزاق حنبلی الوسنی (متوفی ۶۶۱ھ ہجری کی مطالع انوار التنزیل ہے،

(۴) مصباح نام کی گئی کتابیں ہیں، شاید یہاں المروزی (متوفی ۱۰۷ھ) ہجری کی مصباح ہو

علامہ قزوینی نے دیوان حافظؒ کے صفحہ ''قو'' پر مندرجہ بالا کتابوں کے متعلق معلومات درج کرتے ہوئے لکھا ہے یہ دیوان حافظؒ کے بعض قلمی نسخوں میں جو اس کے پاس موجود ہیں یا جن تک اس کی رسائی تھی۔ گلندام کے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ حافظ نے کشاف اور مصباح پر حاشیے لکھے ہیں۔ لیکن بعض دیگر نسخوں میں یہ عبارت دیکھنے میں نہیں آئی۔ بل کہ صرف اتنا ہی لکھا گیا ہے کہ حافظؒ نے اِن کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔

عباس اقبال کا قول ہے کہ کشف کشاف ایک تفسیر کا نام ہے جو حافظؒ کے ایک ہم عصر اہل فارس نے لکھی تھی۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شخص یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص سراج الدین عمر بن عبدالرحمان فارسی قزوینی تھا جو ۷۶۵ھ ہجری میں فوت ہوا تھا۔ وہ حافظؒ کے استاد وقوام الدین عبداللہ اور مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کا شاگرد تھا۔ کتاب کا اصل نام الکشف عن المشکلات انکشاف'' تھا۔

(سخنی چند درباب احوال واشعار حافظؒ تالیف مجدزادہ صبہا چاپ اصفہان۔ ہجری شمسی)

جنھیں حافظؔ کے استاد کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی شمس الدین عبداللہ شیرازی اورقوام الدین ابو اسحاق سنجری۔ تذکرہ ریاض العافین میں درج ہے کہ حافظ کے علاوہ شیخ زین الدین علی کلاہ بھی اسی شمس الدین عبداللہ کا شاگرد تھا۔ علی کلاہ کے بارے میں ہم نے کچھ دل چسپ معلومات حاصل کی ہیں جنھیں اگلے صفحوں میں درج کیا جائے گا۔

صاحب لطائف الخیال نے ایک دل چسپ لیکن غیر قابل اعتماد لطیفہ بیان کیا ہے جس سے میر سید شریف نام کے ایک شخص کے سامنے حافظؔ کے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ بظاہر بڑے پایہ کے عالم نہ تھے۔ اس لیے حقائق معارف کے کچھ ایسے پھول اُن کے گلستان میں کھلے ہیں کہ ہوش مندوں کے فکر و اندیشہ کا دماغ انھیں سونگھنے سے عاجز ہے۔ اُن کا علم اعلیٰ درجہ کا نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حکمت العین میں جہل بسیط کی بحث میر سید شریف سے پڑھ رہے تھے جب میر نے دیکھا کہ حافظ میں اس بحث کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں تو فرمایا کہ جہل بسیط وہی ہے جو تمہارے اس شعر میں نمودار ہوا ہے۔

گفتم این جام جہان بین بتو کئی داد حکیم   گفت آن روز کہ این گنبد مینامی کرد

تم نے کیوں نہیں کہا کہ ''ایجادی کرد''

اس کے بعد صاحب تذکرہ نے کوہ چہل مقام پر حافظؔ کے حضرت ساقی کوثر سے فیضان حاصل کرنے کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ سید میر شریف یا سید شریف جورجانی اپنے وقت کے بڑے عالم اور شاہ شجاع کے حکم سے شیراز میں بنوائے گئے مدرسہ دارالشفا میں درس دیتے تھے۔

۵۔ پیر گلرنگ

علوم متداولہ حاصل کرنے کے لیے جن استادوں کے سامنے حافظؔ نے

جاتا ہے۔

فارسی کے علاوہ حافظؔ نے عرب شاعروں کے دیوان بھی پڑھ لیے تھے اور اُن کے محاسن و معائب سے آشنا تھا چناں چہ بہت سے عربی اشعار کو عینا یا کم وکاست تغیر کے ساتھ اپنی غزلوں میں کھپایا ہے اور اُن سے محمد گلندام کا یہ دعویٰ کہ خواجہ صاحب نے عرب دواین میں تجسّس کی تھی ثابت ہوتا ہے۔ ہاشم رضی نے دیوان حافظ کے آخر میں اُن تمام عربی مصرعوں یا محاوروں کو ایک جگہ جمع کیا ہے جو غزلوں میں لائے گئے ہیں۔

۴۔ حافظ کے استاد

دیوان حافظؔ محمد گلندام کے مقدمہ میں یوں درج ہے۔

''......... مسود این ورق عفا اللہ عنہ ماسبق در درسگاہ دین پناہ سیدنا استاد البشر قوام الملتہ والدین عبداللہ علی درخاتہ اعلی علیین بکرآت دمرآت بمذاکرہ رفتی دراثناءِ محاورہ گفتی کہ این فرایدراہمہ دریک جلد باید کشید''

پروفیسر براؤن نے اپنی ادبی تاریخ میں یقیناً یہی عبارت درج کی ہے۔ لیکن اس سے کہیں بھی یہ نتیجہ نہیں نکالا ہے کہ مولانا قوام الدین حافظ کے اُستاد تھے۔ علامہ قزوینی نے بھی دیوان حافظ پر محمد گلندام کے مقدمہ پر بڑی کاوش اور صحت عبارت کے ساتھ مع مفید حاشیہ ضبط کیا ہے اگرچہ گلندام نام کے کسی بھی شخص کے وجود سے انکار کرتا ہے لیکن کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ مولانا قوام الدین حافظؔ کے اُستاد تھے۔ البتہ علی اصغر حکمت کا خیال ہے کہ مولانا قوام الدین عبداللہ یقیناً حافظ کے اُستاد تھے۔ ریاض العارفین اور دریای کبیر کے علاوہ چند اور تذکروں میں عبداللہ شیرازی کو حافظ کا اُستاد بتایا گیا ہے۔

صاحب عرفات العاشقین نے لکھا ہے کہ حافظؔ ہمیشہ قوام الدین کے حلقہ میں ہوتا تھا دقت کرنے پر معلوم ہوگا کہ ایسے دو شخصوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں

حافظ مرید جام جم است ای صبا برد   وز بندہ بندگی برسان شیخ جام را

اس کے بعد مولانا جامی نے فرمایا کہ حافظ پیر گلرنگ کا مرید اور تربیت یافتہ ہے جو اپنے زمانے کا بڑا دانش ور تھا اور حافظ ہمیشہ اس کی مجلس وعظ میں شریک ہوا کرتا تھا۔

(مقدمہ دیوان از قاسم غنی صفحہ ۲۱)

عبداللہ البیرونی مشہتر بہ افلاطو ن نے حل لا ینحل نام کا ایک رسالہ ۹۶۷ ہجری میں نکلا تھا۔ اس کا ایک نسخہ جس کی کتابت ۱۲۸۲ ہجری میں ہوئی ہے ہاشم رضی کے پاس موجود ہے اس رسالہ میں موئف نے لکھا ہے کہ

> ''شیراز میں ایک پیر تھا جو صفای قلب اور نور باطن میں مشہور تھا اس کی جبین پاکیزگی کے نور سے روشن تھی اور اُس کے رخسار گلگون تھے۔ اسی لیے لوگ اُسے پیر گلرنگ کے نام سے پکارتے تھے۔ جو کوئی اُسے دیکھتا گویا گلاب کا پھول دیکھتا۔ القصہ حافظ کے اکثر اشعار کے مضامین دراصل اسی پیر کی باتیں ہیں جو حافظ نے اس کی روح پرور مجلس میں سُنی تھیں اور بعد میں انھیں نظم کیا۔ اُس کے فضل اور علم کے دیوان سے جو کچھ حافظ کو پسند آیا اپنے دیوان لسان الغیب میں اس کی طرف اشارہ کیا''۔

بہر حال پیر گلرنگ کے وجود کو اس شکل میں مانیں یا نہ مانیں جس شکل میں تذکرہ نویسوں نے اس کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ایک بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ حافظ مرشد کی تلاش میں تھا اور آخر کار اُسے ایک مرد کامل مل گیا جس کا

زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا اُن میں دو کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حافظؔ نے علوم رسمی کی تکمیل کے بعد اپنے وقت کے ایک بزرگ کی مجلس وعظ و گفتار میں شرکت کی تھی۔ اس بزرگ کا نام پیر گلرنگ بتایا گیا ہے اور اکثر تذکرہ نویسوں نے حافظؔ کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے۔

پیر گلرنگ من اندر حق ازرق پوشان　　رُخصت خبث نداد ورنہ حکایت ہا بود

پیر گلرنگ نام کے کسی بزرگ کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ البتہ محمد دہدار نے جامی کی نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیراز میں گلرنگ نام کے ایک بزرگ تھے جو اکثر جامع عتیق میں بسر اوقات کرتے تھے۔ حافظؔ اِن کی مجلس صحبت میں بارہا شامل ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ شہرت ہوئی کہ اِن کا مرید ہو گیا۔ اس کے بعد حافظ کا متذکرہ بالا شعر پیش کیا ہے۔

عبدالحسین بیات کے پاس دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کی کتابت ۸۸۵ (کذا) ہجری میں ہوئی تھی۔ یہ نسخہ اسحاق قاجار تخلص بہ صابر کے پاس بھی رہ چکا ہے۔ اُس نے ۱۲۹۷ ہجری میں خواجہ حافظ کے احوال کے ورق کے حاشیہ پر یہ دلچسپ عبارت لکھی ہے۔

''میں نے دولت شاہ کے ایک تذکرہ میں پڑھا کہ خراسان کا ایک طالب علم تحصیل علم کی غرض سے شیراز چلا گیا تاکہ وہ اپنے زمانے کے مشہور عالم مولانا جلال الدین دوانی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ اُس نے نفحات الانس اپنے ساتھ لی۔ جب مولانا نے یہ کتاب دیکھی اور حافظ کے احوال کا مطالعہ کیا تو اُس کے حاشیہ پر حافظ کا یہ شعر درج کیا ہوا پایا۔

پیر گلرنگ کے ساتھ شیخ علی کلاہ کا نام بھی وابستہ ہوتا ہے جس کو حافظ نے کوتاہ آستین کہہ کر یاد کیا ہے۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں علی کلاہ سے متعلق معلومات درج کی ہیں اس لیے تکرار سے پرہیز کرتے ہیں۔

سیر و سیاحت:۔

دیوان حافظ کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حافظ سیر و سیاحت کی طرف زیادہ مایل نہ تھے۔ اور ساری عمر شیراز کے خطہ دل پذیر میں ہی رہ کر گزاری۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایران کے اکثر شاعروں نے یا تو کسب معاش کے لیے یا کسب شہرت کی غرض سے دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کیا۔ مثلاً صفوی دور میں اس لیے ایران کے کئی چھوٹے اور بڑے شاعر ہندوستان کی طرف چلے آئے کیوں کہ مغلیہ دربار میں اُن کی بڑی قدردانی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اِن کی معاشی حالت بدرجہا بہتر ہو جاتی تھی۔ لیکن حافظ کچھ قناعت پسندی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے وطن میں خوش گذاران زندگی بسر کرتے تھے سفر کی طرف مائل نہ ہوئے ہوں گے۔ شیراز کی آب وہوا اور وہاں کا تہذیبی اور تمدنی سرمایہ حافظ جیسے پُر ذوق شاعر کے لیے مانع سفر بن چکے ہوں گے۔ یہ بات اِن اشعار سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ نے شیراز کی تعریف میں کہے ہیں یا اس سے پہلے سعدی نے بھی کہے تھے۔ مصلیٰ کی گلگشت اور رکنا باد کا پانی حافظ کو سفر پر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

نمی وہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلیٰ و آب رکنا دباد

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

دامن اس نے نہیں چھوڑا۔ اس ضمن میں دیوان میں کئی شعر موجود ہیں مثلاً

گزر بر ظلماتست خضر راہی کو
مباد کآتش محرومی آب ما ببرد

کئی اور اشعار موجود ہیں۔ مثلاً:

قطع ایں مرحلہ بی ہمرہی خضر مکن
ظلماتست بترس از خطر گمراہی

....

پیر دردکش ما گرچہ ندارد زر وزور
خوش عطا بخش وخطا پوش خدائی دارد

....

بندۂ پیر مغانم کہ ز جہلم برہاند
پیر ما ہر چہ کند عین دلالت باشد

اصول تصوف کے تحت بھی پیر و مرشد کا ملنا سالک کے لیے لازمی امر ہے۔ البتہ حافظ کا مرشد جیسے اس کے اشعار سے مستفاد ہوتا ہے اپنی الگ خصوصیات رکھتا ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے وقت کے ظاہر پرستوں اور ریاکاروں کی جماعت سے نہیں جن کی اُس زمانے میں بھرمار تھی۔ اس کا پیر ایسے ریاکاروں کے خلاف ہو کر شراب نوشی اور رندی کو ریا اور زرق پر ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے حافظ کسی شاعرانہ جذبے کے اثر میں آکر نہیں کہتا

دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما

شیراز سے کسی دوسری جگہ خواہ مختصر وقت کے لیے ہی سہی نہیں گے۔ ہمیں دیوان حافظ میں کئی شعر ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کو زندگی کسی کی منزل پر ضرور سیر و سیاحت کا شوق ہوا تھا۔

من کز وطن سفر نگزیدم بہ عمر خویش
در عشق دیدن تو ہوا خواہ دولتم

تذکر نویسوں نے حافظؔ کے تین سفروں کی اطلاع دی ہے یعنی سفر اصفہان سفر یزد اور سفر ہندوستان۔ لیکن اُن کی اطلاع نہ تو یکسان ہے اور نہ ہی مستند۔ اکثروں نے حافظ کے اشعار ہی سے اُن کے سیر و سیاحت کے نتائج کو اخذ کیا ہے بہر صورت ہم ہر ایک سفر پر دستیاب شدہ اطلاع کو مربوط اور تحقیقی نکتہ نظر سے پیش کریں گے۔

یزد کا سفر:۔

یہ معلوم نہیں پڑتا کے یزد کے سفر کا اتفاق حافظ کو کس سال میں ہوا تھا۔ ہم عصر حافظ والے باب میں یزد کی تاریخ کے بارے میں مختصر طور پر چند باتوں کا ذکر کریں گے۔

یہاں اختصار کے ساتھ یہ کہنا کافی ہے کہ نصرت الدین شاہ یحیٰ امیر تیمور کی مدد سے شیراز کا حکمران بنا اور اسی کے ساتھ اپنے اقرا بار کے ساتھ جنگ و جدل میں مصروف رہا۔ البتہ اس کی حکومت کی مدت قلیل ثابت ہوئی۔ غالباً اس وجہ سے بھی حافظ نے اس کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ایک قطعہ کے اس شعر سے کچھ اشارہ ملتا ہے کہ حافظ نے شاہ یحیٰ کی مدح کی۔ لیکن کوئی قصیدہ ایسا ہماری نظر سے نہیں گزرا جو سرتا پا قصیدہ کی صورت میں اسی بادشاہ کے لیے لکھا گیا ہو۔

شاہ منصورم ندید و بی سخن صد لطف کرد

جہاں تک دُنیاوی شہرت کا تعلق ہے حافظ اِن چند خوش قسمت شاعروں میں شامل ہیں جنھیں اپنی زندگی میں ہی خاصی شہرت نصیب ہو چکی تھی۔ وہ اس نکتہ سے باخبر تھے۔ اس لیے کسی دوسری جگہ جا کر کسب شہرت کے لیے سفر کی صعوبتیں اُٹھانا اس بزرگ منش شاعر کے لیے بے معنی تھا۔ ایک اور وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حافظ کے زمانے میں غالباً شیراز ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں زندگی باقی نواحی کے مقابلے میں پُرسکون اور بے انتشار تھی۔ تیمور کی خونریزیوں نے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اس قدیم تہذیبی اور تمدنی گہوارہ کو پاش پاش کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑ رکھی تھی۔ ایران طوائف الملوکی کے دور میں دھکیلا گیا اور ہر طرف شورش اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا۔

حافظؔ کو شیراز سے باہر جانے میں کوئی واقعی دل چسپی نہ تھی۔ اِن کو شیراز کے صاحب کمال لوگوں پر ناز تھا اور اِن کے وجود کو فیض قدسی سمجھتے تھے۔ اپنے ہم عصروں سے جو علم و فضل اور خلوص میں بلند مرتبہ رکھتے تھے دُور ہونا حافظؔ کے لیے قابلِ برداشت نہ تھا۔ شیراز کی تعریف میں ایک عمدہ غزل کے ایک شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

خوشا شیراز و وضع بی مثالش
خداوندا نگہدار از زوالش

....

بہ شیراز آی و فیض روح قدسی
بجوی از مردم صاحب کمالش

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیر و سیاحت کا قطعی شوق نہ تھا یا یہ کہ واقعی

کہ غزل شاہ شجاع کے پاس بھیجی گئی ہو اس کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما — آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

عزم دیدار تو دارد جان برلب آمدہ — بازگردد یا بر آید چیست فرمان شما

ای صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگوی — کای سر حق ناشناسان گوی میدان شما

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست — بندۂ شاہِ شمائیم وثنا خوان شما

ای شہنشاہ بلند اختر خدا را ہمتی

تا ببوسم ہمچو گردون خاک ایوان شما

حسین پژمان کا خیال ہے کہ شیراز واپس آنے کے بعد حافظ نے وزیر توران شاہ کے گھر میں قیام کیا کیوں کہ قرض خواہوں نے ان کی غیر حاضری میں شہر کے قاضی کے پاس جا کر حافظ کو محکوم کروایا تھا۔ ایک قطعہ میں اُنھوں نے اِن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

بہ من سلام فرستادہ دوستی امروز — کہ اے نتیجۂ کلکت سواد بینائی

پس از دو سال کہ بخت بہ خانہ باز آوردر — چرا از خانۂ خواجہ بدر نمی آئی

اصفہان کا سفر:۔

دیوان حافظ میں کئی غزلیں ملتی ہیں جن میں اصفہان کے حکمرانوں کا نام لیا گیا ہے۔ اصفہان اور وہاں کے مشہور دریا زندہ رود کا نام بھی کہیں کہیں شعروں میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے جو اصفہان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے حافظ اصفہان کے سفر پر کبھی نہ کبھی گئے ہوں۔ جہاں تک تذکرہ نویسوں کے قول کا تعلق ہے وہ اس ضمن میں کوئی تسلی بخش اطلاع دینے سے قاصر ہیں۔

عبدالغنی فخر الزمانی نے تذکرہ میخانہ میں صرف یزد کے سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ضبط کیا ہوا فقرہ یہ ہے۔

شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و دہیچم نداد

البتہ کئی غزلوں میں اکا دُکا ایسے شعر ہیں جن میں شاہ یحییٰ کا نام لیا گیا ہے۔ بطور مثال مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

گر نکردی نصرت الدین شاہ یحییٰ این کرم
کار ملک و دین و نظم و اتفاق افتادہ بود

گوئی برفت حافظ از یاد شاہ یحییٰ
یارب بیادش آور درویش پروریدن

شاہ یحییٰ ادب دوست نہ ہونے کے علاوہ بہت بخیل بھی تھا۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں جس سے یہ اخذ کیا جائے کہ شاہ یحییٰ نے حافظؔ کو یزد آنے کی دعوت دی ہو۔ سفر کا کیا باعث بنا یہ بھی معلوم نہیں۔ حافظ اس سفر سے خوش نہ تھے اور دیوان میں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یزد کے سفر میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے تھے جن سے وہ بہت پریشان ہوئے۔ مثلاً اس مطلع کی غزل کو دیکھیے

خرم آن روز کزین منزل ویران بروم
راحت جان طلبم واز پی جانان بردم

اس غزل کے تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن سے دُور رہ کر لکھی گئی ہے یزد میں اپنی اقامت کو ایک مصیبت اور غم سمجھا ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو، وہاں سے شیراز واپس آنا چاہتے ہیں۔ نو اشعار کی اس غزل میں سفر کی تکلیفیں اور وطن واپس آنے کی خواہش کا اظہار ہوا ہے۔

خرم آنروز کزیں منزل ویران بردم　　راحت جان طلبم وزپی جانان بردم

دوم یہ کہ اگر بالفرض امین الدین حسن ہی ہو تب بھی یہ بات نا قابلِ قبول ہے کہ شریعت کا سب سے بڑا علم بردار یعنی شہر کا قاضی عوام الناس میں اتنی بڑی بے عزتی کروانے پر رضا مند ہوا ہو کہ اصفہان کے لوگوں سے اپنا مضحکہ اُڑوائے۔

سوم یہ کہ پوری غزل کے تیور سے اس حادثہ کی تصدیق نہیں ہوتی بل کہ برعکس شاعر کی خوش حالی اور داخلی فراغت وسکون کا پتہ چلتا ہے۔ معترضین کے ان تینوں اعتراضوں میں کافی وزن ہے اور اِن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس بحث سے اگر اصل موضوع کی تائید نہیں ہوتی تاہم غزل مذکرر پر غور کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کے کئی شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ بدگو اپنی خباثت میں لگے تھے۔ چوں کہ حافظ کا اندازِ بیان رمز واشارات سے پُر ہے اور اصولاً اس کی غزل ہر لحاظ سے متنوع ہے اس لیے واقعہ کو صاف اور روشن الفاظ میں بیان کرنے میں تامل ہوا ہوگا۔

بہرحال اس موضوع پر بحث کی ضرورت نہیں کیوں کہ اگر اثبات واقعہ سے یہ مراد ہے کہ حافظؔ کے سفر اصفہان کو تقویت پہنچے تو ہمارے پاس اس کے علاوہ اور بھی کئی شواہد ہیں جن سے اُن کے اصفہان کے سفر کی تائید ہو سکتی ہے۔ لیکن سردست چوں کہ ہم نے اس غزل کی طرف کچھ دیر تک اپنی توجہ مبذول کی ہے لہٰذا لازم ہے کہ اس کو علامہ قزوینی کے ایڈیشن سے نقل کر کے درج کیا جائے۔

مرا عہدیست باجانان کہ تاجان در بدن دارم
ہوا داری کویش را بجان خویشتن دارم
صفای خلوت خاطر ازان شمع چگل جویم
فروغ چشم ونور دل ازان ماہ ختن دارم

''آوردہ اند کہ آن سرغزل دیوان ایقان از شیراز کم
برآمدند مگر اینکہ یک نوبت بہ یزد و باز بشہر مذکور
آرام گرفتہ اند۔''

امین الدین احمد رازی بہ صاحبِ تذکرہ ہفت اقلیم نے ایک شخص بنام قاضی امین الدین حسن کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک قصہ بیان کیا ہے جس کا تعلق حافظ سے ہے۔ امین الدین حسن اصفہان کا قاضی تھا اور شاہ منصور کے زمانے میں اسی عہدہ پر فائز تھا۔ رازی نے لکھا ہے کہ حافظ کو اسی شہر اصفہان میں مستی کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور شہر بھر میں گھمایا گیا۔ جب امین الدین حسن اس واقعہ سے آگاہ ہوا تو فوراً حافظ کے پاس آیا۔ اُن کے سر سے کلاہ اُتار کر اپنے سر پر رکھی اور حکم دیا کہ اُسے (اپنے آپ کو) شہر میں لے جا کر اسی طرح گھمائیں جس طرح حافظ کو گھمایا گیا تھا۔ حافظ نے مندرجہ ذیل غزل اس واقعہ کے سلسلہ میں اور قاضی امین الدین حسن کی مدح میں کہی۔

مرا شرطیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم
ہوا داری کویش را چو جان خویشتن دارم

اس غزل کے مقطع میں یہ شعر آیا ہے۔

برندی شہرہ شد حافظ میان ھمدمان لیکن
چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم

امین الدین احمد رازی کی اس کہانی کی تردید پژمان نے بھی کی ہے اور ہاشم رضی نے بھی۔ اُنھوں نے تین دلیلوں کی بنا پر قصہ کو رد کیا ہے۔

اوّل یہ کہ دیوان حافظ کے قدیم نسخوں میں اس غزل کے مقطع میں ''امین الدین حسن'' نہیں بلکہ ''قوام الدین حسن'' ہے۔ جدید نسخوں میں تحریف کے نتیجہ میں امین الدین حسن لکھا گیا ہے۔

پتہ چلتا ہے کہ اصفہان کا سفر حافظؔ نے پختہ عمر میں کیا تھا اور مقطع میں وطن مالوف اور وہاں کے دوستوں کی یاد کے جذبہ کو بیان کیا ہے۔ یہ انداز ان کی اور بھی کئی غزلوں میں ملتا ہے۔ بل کہ ساقی نامہ ایسے اشارات سے خالی نہیں بشرطیکہ یہ مانا جائے کہ ساقی نامہ بھی انھیں کی تخلیق ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

وصال او ز عمر جاددان بہ	خداوندا مرا آن دہ کہ آن بہ
بداغ بندگی مُردن برین در	بجان او کہ از ملک جہان بہ
بخلدم دعوت ای خواجہ مضرمای	کہ این سیب زنج ازن بوستان بہ
اگرچہ زندہ رود آب حیاتست	دلی شیراز ما از اصفہان بہ

اصفہان کے سفر کی شیرین یاد حافظؔ کے دل میں باقی رہی۔ انھوں نے وہاں کے دوستوں بزرگوں، اور صاحب دلوں کو گرم جوشی سے یاد کیا ہے۔ انھیں دُعائیں دی ہیں اور اُن سے جسمانی دوری پر حسرت و افسوس کا اظہار بھی کیا ہے مندرجہ ذیل غزل کے بارے میں بھی قیاس ہے کہ اصفہان سے واپس آکر اس شہر کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ اِن کے اور سفر یزد کے بارے میں جو غزلیں اور شعر موجود ہیں اُن کے درمیان لب ولہجہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

روز وصل دوستداران یاد باد	یاد باد آن روزگاران یاد باد

ہمارا قیاس ہے کہ حافظؔ نے اصفہان کا سفر شاہ منصور کے عہد حکومت میں انجام دیا تھا۔ اس بادشاہ کی مدح میں حافظؔ نے ایک پُر زور قصیدہ بھی کہا ہے اور اس کی فراخ دلی اور علم دوستی کی تعریف کی ہے لگتا ہے۔ کہ سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے حافظؔ کو سلطان کی طرف سے مالی امداد بھی ملی ہوگی چناں چہ۔

بکام آرزدی دل چو دارم خلوتی حاصل
چہ فکر از خبث بدگویان میان انجمن دارم

مرا اور خانہ سروی ہست کاندر سایہ قدش
فراغ از سرو بستانی و شمشاد چمن دارم

گرم صد لشکر از خوبان بہ قصد دل کمیں سازند
بحمد اللہ و المنۃ بتی لشکر شکن دارم

سزد کز خاتم لعلش زنم لاف سلیمانی
چو اسم اعظمم باشد چہ باک از اہرمن دارم

الا ای پیر فرزانہ مکن عیبنم ز میخانہ
کہ من در ترک پیمانہ دلی پیمان شکن دارم

خدارا ای رقیب امشب زمانی دیدہ برہم نہ
کہ من با لعل خاموشش نہانی صد سخن دارم

چو در گلزار اقبالش خرامانم بحمد اللہ
نہ میل لالہ و نسرین نہ برگ نسترن دارم

برندی شہرہ شد حافظ میان ہمدمان لیکن
چہ غم دارم کہ در عالم قوام الدین حسن دارم

دیوان حافظ میں موجود کئی غزلوں سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حافظ کو اوّل تو اصفہان کے سفر کی بڑی آرزو تھی اور بعد میں یہ آرزو پوری بھی ہو گئی چناں چہ اصفہان کی آب و ہوا کی خوشگواری اور زندہ رود کی تعریف ایسے لہجے میں ہوئی۔

اگر ''سلیمی مذحلّت بالعراق'' مطلع کی غزل کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے اصفہان میں قیام کے دوران ہی لکھا گیا ہے۔ چوتھے شعر سے

دربار میں مسندِ وزارات پر متمکن تھا۔ اس نے زادراہ بھیج کر بلایا۔ حافظؔ نے اس رقم میں کچھ کو بھانجوں کی ضروریات میں صرف کیا اور کچھ ادائے قرض میں جو کچھ باقی رہا اس سے زارسفر کا سامان مہیا کر کے شیراز سے روانہ ہوا۔ لار نام کی ایک جگہ پہنچ کر کسی دیرینہ دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس کا مال واسباب کسی حادثہ میں لٹ چکے تھے۔ حافظؔ کے پاس جو کچھ تھا اس کو بخش دیا اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے۔ اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی دو معروف ایرانی تاجر بھی ہندوستان جارہے تھے۔ انھیں یہ حال معلوم ہوا تو حافظ کے مصارف کے کفیل ہوئے۔ لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کے ناز کب تک اُٹھائے جاسکتے ہیں۔ حافظ کو رنج ہوا تاہم صبر سے کام لیا اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز بندگاہ پر آیا تھا اور ہندوستان کو واپس جارہا تھا سوار ہوئے۔ اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہ اُٹھایا تھا کہ طوفان بپا ہوا۔ خواجہ جہاز سے اُترے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کے پاس بھیج دی۔''

دمی باغم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد
بہ می بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

افضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں

اگر چہ ما بندگان پادشہیم
پادشاہان ملک صبح گہیم

کے مطلع کی غزل میں جس کا اشارہ منصور کی طرف ہے حافظ نے قرضہ یا مالی استعانت کی رقم وگذار کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

وام حافظ مگو کہ باز دہند کردہ ای اعتراف ما گواہیم

ہندوستان کا سفر:۔

کئی تذکروں میں حافظؔ کو ہندوستان آنے کی دعوت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تصدیق یا تردید بڑا مشکل اور اہم کام ہے۔ براؤن نے اس ضمن میں شبلی نعمانؔی ہی کا حوالہ دیتے ہوئے کچھ واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ جدید ایرانی محققوں نے اس مسئلہ میں بڑے شکوک پیدا کیے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قبل ازین کہ اسے زیر بحث لایا جائے ممناسب ہوگا کہ شعرالعجم میں درج شبلی نعمانی کی عبارت کو نقل کیا جائے کیوں کہ شبلی کی دی ہوئی تفصیل باقی تمام تذکرہ نویسوں کی تفصیل کی نسبت وسیع تر ہے شبلی فرشتہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

''دکن میں سلاطین بہمنی کا دور تھا اور سلطان شاہ محمد بہمنی مسند آرا تھا۔ وہ نہایت قابل اور صاحب کمال سلطان تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا۔ عام حکم تھا۔ کہ عرب اور عجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدے پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے انعام میں دیے جائیں۔ اس کی قدر دانیوں کی شہرت سُن کر حافظؔ کو دکن کے سفر کا شوق دامنگیر ہوا۔ لیکن شوق ہی شوق تھا۔ یہ خبر میر فضل اللہ کو ملی جو محمود کے

سفر کی دشواریوں سے باخبر تھے۔ اور پھر ہندوستان جیسے ملک کے طویل سفر سے جس کے لیے کم از کم ایک سال تو درکار تھا ہی۔

۲۔ فرشتہ کا قول ہے کہ نازک مزاج شاعر کی ناز برداریاں دو تاجروں کے ذریعے کب تک ممکن تھیں۔ یہ بات قابل، قبول نہیں جو شخص ایران کے تہذیبی اور تمدنی ورثہ اور ایرانیوں کی علم دوستی اور ادب پروری سے بخوبی واقف ہیں ایک ایسے عظیم شاعر کی ناز برداریوں سے تنگ آئے ہوں۔ جس کی قربت اُنھیں نہ صرف شہرت عطا کرتی بل کہ مالی فواید کے لحاظ سے بھی بخصوص خواجہ کازرونی کے لیے ایسا رویہ اختیار کرنا قطعی ناممکن سا لگتا ہے کیوں کہ کازرون کے ساتھ حافظ کے جذباتی تعلقات کا ہونا لازمی تھا، جو لوگ ایرانیوں کی وطن پرستی، انسان دوستی اور ہموطنیت کے لطیف جذبات کی سرشاری سے آگاہ ہیں انھیں فرشتہ کے قول کو قبول کرنے میں بڑی دِقت محسوس ہوئی ہے۔ کیا یہ دو تاجر اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ حافظ جیسے شاعر کا ہندوستان میں ہونا، خاص کر جب وہ سلطان دکن کی دعوت پر ہندوستان آرہے تھے ان کے لیے رسوخ اور احترام فراہم کرنے میں ممد ہوسکتا ہے۔

۳۔ جہاز میں اُترتے ہیں سمندر میں طوفان آیا اور حافظؔ گھبرا کر اُلٹے پاؤں چلے آئے یہ بچوں جیسی بات ہے کیا پچیس برس کے حافظؔ کو سمندر میں رونما ہونے والے طوفانوں کے خطروں کا پہلے سے انداز نہیں تھا۔ جو شخص ''شب تاریک بیم موج دگرابی چینن ہایل'' جیسے ہولناک منظر کی تصویر کھینچ سکتا ہے کیا وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے طویل سمندری سفر کے دوران اُسے بہ نفس نفیس ان خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ عقل وسلیم قبول نہیں کرتی کہ حافظ اس قدر تنگ مزاج آدمی تھے۔

۴۔ اگر یہ غزل شاہ محمود کے لیے کہی گئی ہوتی تو اس کا صلہ ضرور حافظؔ کو ملتا اور لازمی تھا کہ صلہ کے شکرانہ میں وہ کوئی قصیدہ یا غزل لکھتے جن میں سابقات کی

عرض کی اور اس سے متعلق سارا ماجرا بیان کیا کہ۔
سلطان نے دربار کے اہم اور معتمد رکن محمد قاسم مشہدی کو ایک ہزار طلائی سکہ (ٹنکہ) دیے تاکہ ہندوستان کی عمدہ مضوعات خرید کر حافظؔ کی خدمت میں پیش کرے۔"

شبلی نعمانی نے یہ قصہ تاریخ فرشتہ سے اخذ کیا ہے یہ تاریخ ۱۰۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی تھی اور آج تک بڑی مستند مانی جاتی ہے۔ چوں کہ یہ تاریخ حافظ کی وفات کے صرف ۲۳ برس بعد میں لکھی گئی ہے اس لحاظ سے ممکن ہے کہ قصہ متذکرہ بالا میں کمتر مبالغہ ہو۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالمقتدر نے کتاب خانہ بالکی پور میں فارسی کتابوں کی فہرست میں حافظ کی اس غزل کا روے سخن محمود شاہ بہمنی کی طرف بتایا جاتا ہے۔ جو ۷۸۰ ہجری سے لے کر ۷۹۹ ہجری تک دکن کا سلطان تھا۔ یہ زمانہ بھی حافظؔ کے دورِ حیات کے ساتھ سات سال چھوڑ کر مطابقت رکھتا ہے اس لحاظ سے بھی تاریخ فرشتہ کی دی ہوئی داستان درست معلوم ہوسکتی ہے لیکن اس کی تردید مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر ہوسکتی ہے۔

۱۔ محمد شاہ بہمنی کا دورِ سلطنت ۷۸۰ھ ہجری سے لیکر ۷۹۹ھ ہجری تک تھا۔ حافظؔ نے ۷۹۲ھ ہجری میں ۶۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ لہٰذا جس وقت محمد شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا اُسوقت حافظ کی عمر گویا ۵۴ برس کی۔ اگر یہ فرض کریں کہ محمود شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی تب بھی ایک سال کا وقفہ ہوا ہی ہوگا اور گویا پچپیں برس کی عمر میں حافظؔ کو ہندوستان آنے کی دعوت ملی ہوگی۔ ہمیں یہ قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ حافظ جیسا وارستہ شاعر پیرانہ سری میں ہندوستان جیسے دور راداز ملک کے سفر کی صعوبتیں اُٹھانے پر آمادہ ہوا ہو۔ جب کہ اس نے جوانی میں یزد کے سفر کے بعد مصمم ارادہ کیا تھا کہ آئندہ کسی سفر پرنہیں جائے گا۔ وہ

کُرت خاندان کا سلطان ہے جو ۷۹۳ ہجری میں حکمرانی کرتا تھا۔ اُستاد علی اصغر حکمت کا کہنا ہے کہ اِن تینوں رایوں میں سب سے پہلی رائے یعنی یہ کہ سلطان غیاث الدین والی بنگالہ کی طرف اشارہ ہے زیادہ قرین قیاس معلوم پڑتی ہے کیوں کہ غزل میں ایک بار بنگالہ لایا گیا ہے یعنی

لشکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

(۲) کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ سلطان غیاث الدین ۷۹۲ہ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا اور یہ حافظ کا سال وفات ہے۔ اس لیے شبلی کے قول کو قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ پڑمان کا خیال ہے کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سلطان غیاث الدین نے حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ اس کی تخت نشینی سے بہت پہلے دی ہوگی۔

یہاں ہم اصل موضوع سے ہٹ کر تھوڑی دیر کے لیے زیر نظر غزل کے متعلق چند باتوں کو درج کریں گے۔ اس غزل کا مطلع یعنی

ساقی حدیث سرو گل و لالہ میرود　　　دین بحث با ثلاثہ غسالہ میرود

ہمیشہ بحث طلب رہا ہے۔ مولوی عبداللہ المقتدر نے کتاب خانہ بانکی پور پٹنہ میں فارسی کی فہرست میں اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین کی تین کنیزیں تھیں جن کا نام سرو، گل، و لالہ تھا۔ شاید وہ سلطان سے عشق کرتی تھیں اور حافظ کے کان تک یہ بات پہنچی تھی۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے ثلاثہ غسالہ کہا لیکن حکمت نے لکھا ہے کہ ثلاثہ غسالہ شراب کے اُن تین گھونٹوں کو کہتے ہیں جو رات کا خمار اُتارنے کے لیے علی الصبح پیئے جاتے ہیں۔

طرف اشارہ ہوتا۔ ایسا نہیں ہوا ہے۔ دیوان میں نہ تو اس کی مقصد کا کوئی قصیدہ ہی ہے اور نہ کوئی غزل ہی ہے اور نہ کوئی غزل۔

شبلی کا کہنا ہے کہ شاہ محمود بہمنی کے علاوہ بنگالہ کے فرمانروا سلطان غیاث الدین نے بھی حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی اور چوں کہ اُن کے کلام سے مستفیض ہونا چاہتا تھا یہ مصرعہ طرح اُن کے پاس بھیجا۔

ساقی حدیث سرووگل ولالہ میرود

حافظ ے اس طرح پر اپنی مشہور و معروف غزل لکھ کر بھیجی۔

ساقی حدیث سرد وگل ولالہ میرور دین بحث باثلاثۂ غسالہ میرود

شبلی نے اس قصہ کے لیے کسی تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ براؤن نے اپنے معمول کے مطابق شبلی سے قول نقل کرتے ہوئے ساری ذمہ داری اُسی پر ڈالی ہے۔

اس داستان کی تردید میں کئی دلیلیں دی گئی ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ داستان بے بنیاد ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ۔

(ا) غزل میں سلطان غیاث الدین ممدوح کے طور پر لایا گیا ہے۔ اس بادشاہ کے بارے میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیاث الدین بن اسکندر ہے جو مغربی بنگال کے ''شہر پانڈوا'' کا سلطان تھا۔ اور ۷۶۷ہجری میں مسند حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے باپ کی بنائی ہوئی عمارتوں کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ وہی محمود شاہ دکنی ہے جس کا ذکر ہم نے گذشتہ اوراق میں کیا۔ تیسرے خیال کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیاث الدین پیر علی دراصل

تہران یونی ورسٹی کے کتاب خانہ میں ایک قلمی نسخہ ہے جو مختلف نگارشات پر مشتمل ہے قاسم بیگ پرناک اس کا موئف ہے۔ اس میں درج ہے کہ جب شاہ شجاع نے عباسی خلف کے خطبہ کو عام کیا تو شہر کے کچھ بزرگوں نے جو مرتضٰی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شہر ترک کر کے شاہ شجاع کے مخالفوں کے پاس جا کر پناہ لی۔ حافظؔ شیرازی بھی شیراز چھوڑ کر بغداد چلے گئے۔ جہاں جلایری خاندان کے سلاطین نے اِن پر بڑی عنایات کیں۔ وہ سلمان ساوجی کے ہمراہ شاہ مردان کی زیارت کو گئے اور عتبہ بوسی کے بعد یہ غزل سلمان نے اپنے خط میں لکھ کر دروازے پر آویزان کی۔

مرکس کہ ندارد بہ جہاں مہر تو در دل　　　　حقا کہ بود طاعت او ضائع و باطل

حافظؔ اور جلایری سلطان اویس شیخ ایلکانی کے درمیان غالباً دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ چناں چہ حافظؔ کی اس مطلع کی غزل سے ہمارے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

خوش آمد گل وزآن خوشتر بناشند　　　　کہ در دستت بجز ساغر نباشد

ممکن ہے سلطان اویس ایلکانی نے حافظؔ کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی ہو۔ لیکن کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ سفر امکان پذیر نہ ہوسکا۔ خیال ہے ذیل کی غزل اسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
ببانگ چنگ مخورمی کہ محتسب تیز است

جلایری خاندان کا دوسر بادشاہ سلطان احمد ۷۸۴ ہجری میں تحت نشین ہوا۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس سلطان اور حافظؔ کے درمیان اچھے روابط کا ذکر

استاد بدیع الزمان فروزانفر نے دیوان شمس تبریز کو تعلیقات اور حواشی سمیت تہران میں چھاپا ہے اس نے تعلیقات میں لکھا ہے کہ ثلاثہ غسالہ صبح اور دو پہر کے درمیان پی جانے والی شراب ہے۔

ہاشم رضی نے دیوان کے صفحہ ۹۴ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ''ثلاثہ غسالہ رسالہ شراب کہ بوقت صبح نوشند و آن شویندۂ غمہا شویندۂ کثافت بدن، و مزیل کدورت بشریات باشد''۔ یہ معنی دراصل غیاث اللغات سے لیے گئے ہیں اس توضیح کے بعد شبلی کی بتائی ہوئی داستان کی تردید اور بھی استوار ہو جاتی ہے۔

مقطع سے پہلے کے شعر میں ''گلستان شاہ کی ترکیب لائی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ کسی معروف جگہ کا نام ہو۔ آذربایجان میں گلستان نام کا ایک قصبہ ہے جو حافظ کے زمانے میں سلاطین جلایر کی قلمرو میں شامل تھا۔ چناں چہ سلطان اویس ایلکانی سے منسوب حافظ کی ایک غزل کا ایک شعر یہ ہے

غنیمت دان دعی خور در گلستان کہ گل تا ہفتہ دیگر بنا شد

بغداد کا سفر:۔

یہ حکایت بھی سُننے میں آئی ہے کہ حافظ نے بغداد کا بھی سفر کیا تھا۔ اگرچہ حافظؔ نے یقینی طور پر صرف یزدہی کا سفر کیا تھا اور شیراز کی آب و ہوا سے وہ بہت خوش تھے۔ اس کے باوجود اِن کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے بغداد کے سفر کی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔

رہ بز دیم بہ مقصود خواند رشیراز خرم آندوز کہ حافظ رہ بغداد کند

حافظؔ کے زمانے میں جلایری خاندان بغداد اور شمالی مغربی ایران پر حکمران تھا۔ امیر مبارزالدین کی سخت گیری اور تعصب کی وجہ سے شہراز میں حالات ابتر ہو گئے۔ حافظ اس خراب ماحول سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔

۱۱۔ شیخ عماد فقیہ[1] (متوفی ۷۷۳ ہجری)

پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبی ایران میں لکھا ہے کہ عماد فقیہ کرمانی کی زیادہ شہرت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اس کو خواجہ حافظ شیرازی کا حریف خیال کیا گیا ہے کیوں کہ حافظ نے عماد پر طنز کیا ہے۔

اے کبک خوشخرام کجا میروی بایست

غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

اس کہانی کا آغاز دراصل تذکرہ حبیب السیر کے حوالے سے ہوا ہے۔ عماد کے حالات درج کرتے ہوئے موئف نے کہا ہے کہ عماد کرمان کے علما میں سب سے برتر تھا۔ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ نماز کے وقت بلی بھی اُس کے ساتھ سجدہ میں جھک جاتی تھی۔ شاہ شجاع نے اس کو عماد کی کرامت خیال کیا۔ کیوں کہ شاہ شجاع ہمیشہ عماد کا حد سے زیادہ احترام کرتا تھا۔ حافظؔ کو اس پر رشک آیا۔ اور اس پس منظر میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

صوفی نہاد دام دسر حقہ باز کرد بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

عام لوگوں کا خیال ہے کہ حافظؔ اور عماد کے درمیان شکر رنجی اس لیے بھی ہوئی ہوگی کیوں کہ عماد شاہ شجاع کو حافظؔ کے بارے میں بدظن کرنا چاہتا تھا۔ اس قصہ کو قبول کرتے وقت چند باتوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔

مجد زادہ صبہا نے سخنی چند دربارۂ حافظؔ میں شاہ شجاع کی عمادؔ سے ارادت کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ ان میں کوئی وجہ ایسی نہیں جو عماد اور حافظ کے درمیان شکر رنجی کا باعث بنتی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ شاہ شجاع کی ماں خان قتلغ مخدوم شاہ کرمان کے قراخطائی سلطان قطب الدین کی بیٹی تھی اور عماد کے ساتھ بڑی

---

[1] شیخ عماد پر مفصل اطلاع کے لیے ناظر زادہ کرمانی کا رسالہ ملاحظہ ہو، جو اس نے تہران یونی ورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پیش کیا۔

کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"..........سلطان احمد شاہ بغداد را اعتقاد عظیم در حق خواجہ بودی و چندان کہ حافظ را طلب داشتی و تفقد رعایت کردی حافظ از فارس بجانب بغداد رغبت نکردی و بہ خشک پارہ اسی در وطن مألوف قناعت نمودی و از مشھد شہر ہای غریب فراغت داشتی و این غزل در مدح سلطان احمد بہ دار االسلام بغداد فرستاد۔"

احمد اللہ علی معدلہ السلطانی
احمد اویس حسن ایلکانی
خان بن خان وشہنشاہ نژاد
آنکہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی

حافظ کے شیراز سے باہر کے سفروں یا دعوتوں کا ذکر تمام ہوا۔ اب ہم اِن کے کچھ ہم عصر نامور شخصیتوں کا ذکر کریں گئے۔ جن کے ساتھ اِن کے تعلقات کے بارے میں کم یا زیادہ اطلاعات ملتی ہیں۔ اس موضوع پر معمول کی طرح ہماری جانکاری کے منابع غیر تسلی بخش ہیں۔ ہمیں صرف اُن ناقص شعروں کے سہارے کچھ سوچنا پڑتا ہے جو تذکروں میں درج ہو چکے ہیں۔

دیوان حافظ کا مطالعہ کرتے وقت کئی مشہور شخصیتوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اِن میں بعض کا نام صیر یحاً لیا گیا ہے۔ اور بعض کا بطور اشارہ۔ ہم سلاطین وقت کا ذکر اس ضمن میں یہاں نہیں کریں گے کیوں کہ اس کے لیے ہم نے الگ باب مخصوص کیا ہے۔ یہاں صرف اِن اشخاص کا ذکر کریں گئے جو کسی نہ کسی بات کے لیے ہمارے موضوع یعنی حافظ کے حالات اور زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔

شاہیر علما و عرفا چوں رنگ سیاہ را کلاہ میگویند شیخ دستار
سیاہ رنگ بستہ و بہ این لقب ملقب شد و با
خواجہ شمس الدین محمد شیرازی در خدمت شمس الدین
عبداللہ شیرازی تحصیل می نمود۔''

لیکن شیخ علی کلاہ کی طرف حافظؔ کے اشارے کے بارے میں سب سے زیادہ معنی خیز اطلاع ہمیں تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کے ایک نسخہ کے حاشیے پر مندرجہ عبارت سے ملتی ہے۔ یہ نسخہ اس وقت عبدالحسین بیات کے ذاتی کتاب خانہ میں موجود ہے۔''

ایک شخص بنام اسحٰق قاچار مخلص بہ صابر نے ۱۲۹۸ ہجری میں اس نسخہ میں حافظؔ کے شرح احوال کے اوراق کے حاشیہ پر اپنے خط میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے۔

''میں نے دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ کے ایک نسخہ پر لکھا ہوا دیکھا کہ خراسان کا ایک طالب علم کسب علم کے لیے شیراز میں مولانا جلال الدین دوانی کی خدمت میں آیا۔ وہ جامی کی نفحات الانس ساتھ لایا تھا۔ جب یہ کتاب مولانا کی نظر سے گذری اور اس نے حافظ کے شرح حال کے اوراق کا مطالعہ کیا تو ایک شعر ملا حافظ سے منسوب کیا جاچکا تھا۔''

حافظؔ مرید جام جم است ای صبا برد
وز بندہ بندگی برسان شیخ جام را

اس کے بعد مولانا جلال الدین دوانی نے فرمایا کہ حافظ پیر گل رنگ[1] کا

---

[1] پیر گلرنگ کے بارے میں گزشتہ اوراق میں چند باتیں بیان کی جاچکی ہیں۔ مفصل اطلاع کے لیے ملاحظہ ہو ''بہارستان سخن'' تالیف میر عبدالرزاق خوانی۔ چاپ مدرس تہران۔ ص ۳۳۶

ادارت رکھتی تھی۔

دوسری یہ کہ عماد کے مرید اکثر آلِ مظفر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہتے تھے۔اس لیے شاہ شجاع اُن کو قابو میں رکھنے کی غرض سے عماد کا اثر ورسوخ حاصل کرنے پر مجبور تھا۔لہٰذا عماد کے ساتھ اس کی دوستی دراصل سیاسی اغراض کی بنیاد پر تھی۔

کئی محققوں کی رائے ہے کہ ''گربہ عابد والی داستان کی کوئی اصلیت اور بنیاد نہیں۔ حافظ کا اشارہ کلیلہ دومنہ بہرام شاہی میں مندرج ''کبک وگربہ'' کی مشہور حکایت کی طرف ہے حافظ عماد کے ساتھ نہ صرف کوئی چشمک نہیں رکھتا تھا بلکہ اِن کے درمیان دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات برقرار تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ ایک دوسرے کی غزلوں سے اقتدار بھی کرتے تھے۔اس رائے کا اظہار سب سے پہلے ابن یوسف شیرازی نے کیا ہے۔اس نے واضح الفاظ میں داستان کو غلط اور بے بنیاد بتایا ہے[1]

کئی تذکروں میں اس حصہ سے متعلق اشارہ ایک شخص بنام علی کلا (ہنتر) کی طرف ہوا ہے۔ اِن تذکروں میں مندرجہ ذیل شامل ہیں جن میں درج کی گئی عبارت کو مختصر طور پر بیان کیا جائے گا۔

ا۔ عرفات العاشقین: تالیف تقی بن معین الدین اوحدی .... وبعضی بہ شیخ علی کلاہ نسبت کردہ اند۔''

۲۔ ریاض العارفین تالیف رضا قلی خان ہدایت۔
''..........علی شیرازی وھو شیخ زین العابدین کلاہ از

---

[1] فہرست کتاب خانہ مجلس شوری ملی ۱۱۰ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶ تا ۳۶۲ مزید اطلاعات کے لیے کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی بہ تصحیح استاد عبدالعظیم قریب۔ باب پنجم ص ۱۷۲ تا ۱۷۲

این رباعی درشان دی گفته۔"

باشمس ھدی راہ خدارا پیمودم　　تحصیل علوم زنز واو بنمودم
تہذیب صفات نفس امارہ خویش　　از خلق جناب مولوی فرمودم

شیخ علی کلاہ کے علاوہ ایک اور شخص کا سراغ ملتا ہے جس کی طرف حافظ کے زیرِ نظر شعر کا اشارہ ممکن ہے ۔ اور وہ مولانا عبد اللہ قوام شیرازی ہے۔حاج میرزا حسن فسائی نے اپنی تاریخ یعنی فارس نامہ ناصری کی دوسری جلد کے صفحہ ۱۳۸ پر مولانا عبداللہ قوام الدین شیرازی کا حال درج کرتے ہوئے کہا ہے کہ شیراز کا یہ عالم وزاہد اپنے وقت کا یگانہ شخص تھا۔شاہ شجاع کو اس سے بڑی عیقدت تھی بل کہ اس کا ارادت مند تھا۔حضرت مولانا نے ایک بلی پال رکھی تھی جو نماز کے وقت اس کے ساتھ سر بسجدہ ہو جاتی۔حافظ نے طنزاً ایک غزل اسی لیے کہی یعنی۔

"صوفی نہاد وام وسر حقہ باز کرد۔ بنیادمکر با فلک حقہ باز کرد" البتہ صاحب فارس نامہ کا بیان سقم سے خالی نہیں۔ وہ یہ کہ اوّل تو کچھ تذکرہ نویسوں نے نہ یہ لکھا ہے کہ حافظ ہمیشہ مولانا عبداللہ قوام الدین یا قوام الدین عبداللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوتے تھے اور نہ دیوان حافظ کے مقدمہ نویس محمد گلندام نے لکھا ہے کہ عبداللہ قوام الدین حافظ کا استاد تھا۔ان بیانات کے پیش نظر یہ بات قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ مبہم غزل اپنے ہی استاد کے تعرض میں لکھی ہو اگر یہ بھی مال لیں کچھ وقت کے بعد اِن کے تعلقات اچھے نہ رہے۔ حالاں کہ۔ایسی صورت حال کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ عماد الدین گوشہ گیر اور منزوی تھا۔ وہ عارف باصفا روور یا سے بالاتر ہو کر خاندان مظفری کے ساتھ مخلصانہ روابطہ رکھتا تھا۔

غریبہ پر مہارت رکھنے کے علاوہ صاحب تسخیر بھی تھا۔
اس سے بڑے عجیب اور غریب امور صادر ہوا کرتے
تھے۔ اس لیے اپنے زمانے میں ''زراق زمان'' کے
نام سے مشہور ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظؔ
کے زمانے میں بزرگان دین اور پیشوایان اہل یقین
کا درجہ کس قدر مشکل تھا''

شیخ علی کلاہ کے بارے میں عرفات العاشقین میں تفصیل سے ذکر آیا ہے
جس کو یہاں اختصار سے نقل کیا جائے گا۔

''شیخ علی کلاہ شیرازی از مشائخ صاحب سجادہ کامل
واقف، عارف جامع بہ اکثر علوم ورسوم رسیدہ ودر
مراتب اسماء وتسخیرات یگانہ وفرید منفرد وبی بدیل آمدہ
ووفات ومرقدش در شیراز است۔ گویند تا زمان شاہ
شجاع باقی بودہ ومیان وی وخواجہ شمس الدین محمد حافظؔ
مباحثات ومکالمات شد والحق وی از جملہ واصلان
ومرشدان صاحب قدرت بودہ۔ امور عجیبہ غریبہ
از وی نقل نمودہ اند۔ در تذکرہ المشائخ مسمأ بہ مقالۃ
الابرار مذکور است کہ قطب الاولا ولاصفیا واقف درکا
ر صمدیت، عارف بارگاہ احدیت، سالک آگاہ،
مجذوب الاہ۔ زین الحق والدین علی بن محمد کلاہ
در تحصیل علوم دینیہ ویقینیہ از طلب متر ودین وادث
علوم حقیقی المختص بہ لطائف الاہ ابوشمس الحق والدین
عبداللہ شیرازی بودہ ووارث تمام کذادی داشتم و

نوشت کلامی و سلامی نفرستاد　　　　صد نامہ نوشتیم و جوابی نفرستاد

....

اگر آن طاہر قدسی ز ورم باز آید　　　　اگر آن طائر فرخندہ لقا باز آید

عمر برگشتہ بہ پیرانہ سرم باز آید　　　　جان علوی بہ تن سفلی باز آید

ذیل میں ہم دونوں شاعروں کی ایک ہی زمین میں بڑی روان اور شیوا غزل درج کرتے ہیں تا کہ یہ پتہ چلے کہ معنوی لحاظ سے بھی شیخ عماد اعلیٰ پایہ کا تھا اس کی شخصیت کے معنوی پہلو کو سمجھنے میں شاید اس مقابلہ سے مدد ملے۔

حافظ

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست　　　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

در آن زمین کہ نسیمی وزد ز طرۂ دوست　　　　چہ جای دم زدن نافہ ھای تاتاریست

بیار بادہ کہ رنگین کنیم جامۂ زرق　　　　کہ مست جام غروریم و نام ہوشیاریست

خیال زلف تو پختن نہ کار خامان است　　　　کہ زیر سلسلہ رفتن طریق عیاریست

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد　　　　کہ نام آن نہ لب و لعل و خط زنگاریست

جمال شخص نہ چشم است و زلف و عارض خال　　　　ہزار نکتہ درین کار و بار لداریست

قلندران حقیقت بہ نیم جو نخرند　　　　قبای اطلس آن کس کہ از ہنر عاریست

آستان تو مشکل توان رسید آری　　　　عروج بر فلک سروری بد شواریست

سحر کرشمہ وصلت بخواب میدیدم　　　　زہی مراتب خوابی کہ بہ ز بیداریست

دلش بنالہ میازار و ختم کن حافظ

کہ رستگاری جاوید در کم آزاریست

عماد

آمید بلبل ز گل وفا داریست　　　　دلی وفا نکند شاہدی کہ بازاریست

بیاد عارض زلفش نشستہ ام ہمہ شب　　　　کہ روز روشن عشاق در شب تاریست

ابن یوسف بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے کہ عماد عارف تھا اور کشکول اور تبرزین اور خانقاہ تک سے بے نیاز تھا۔ اس کی تائید تو خود اُس کے اپنے اشعار سے ہوتی ہے۔

من این بدعت نمی آرم درا سلام
کہ چوں رہبان روم در کوہساران
دو منزل ور جہانم اختیار است
میان باغ وطرف جویباران

ظاہر ہے کہ ایسے آزاد منش اور وارستہ شخص کو کیا پڑی تھی کہ شاہ شجاع کو حافظ کے خلاف اُکساتا اور اپنے لیے زحمت کا سامان مہیا کرتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کے درمیان مخلصانہ تعلقات برقرار تھے اور ایک دوسرے کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے۔ بطور مثال ایسے ہی کچھ مطلع ملاحظہ ہوں۔

حافظ	عماد
زدر دراو شبستان ما منور کن	بیا دکلبۂ ما را شمی منور کن
ہوای مجلس روحانیاں معطر کن	میان مجلس ما ہمچو شمع سر بر کن
رود در رہش نہادم و بر ما گذر نکرد	بگذشت یار و بر من مسکین نظر نکرد
صد الطف چشم داشتم و یک نظر نکرد	واندایشہ ز آب دیدہ آہ سحر نکرد

....

حافظ	عماد
ای پیک راستان خبر یار ما بگو	امی پیک آشنا خبر آن صنم بگو
احوال گل بہ بلبل دستاں سرا بگو	با این گدا حکایت آن محتشم بگو

....

حافظ	عماد
دیریست کہ دلدار پیامی نفرستاد	مشکین خط مارفت وخطابی نفرستاد

نخست پادشہی ہمچو اولایت بخش	کہ جان خویش پرورد و داد عیش بداد
دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین	کہ قاضیی بہ از و آسمان ندندارد یاد
دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین	کہ بہ یمن ہمت او کارہای بستہ گشاد
دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف	بنای کار موافقت بنام شاہ نہاد

نظیر خویش نگذاستند و بگذشتند

خدای عز و جل جملہ بیامرزاد[1]

دیوان حافظ میں پانچ بار صریحاً حاجی قوام کا ذکر اور اس کی مدح میں شعر ملتے ہیں۔ تین بار غزلوں میں اُس کی زندگی کے دوران ہی نام لیا گیا ہے۔ اور دو بار اس کی موت کے بعد چوں کہ حاجی قوام الدین حسن ۷۵۴ ہجری میں فوت ہوا اس لیے یہ تینوں غزلیں حافظ کی وفات سے کم از کم اڑتیں سال قبل لکھی گئی ہیں غزلوں کے مطلع یوں ہیں۔

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما

مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

....

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام

مجلس انس حریف ہمدم و شرب مدام

....

مرا عہدیست با جانان کہ تا جان در بدن دارم

ہواداری کویش را بجان خویشتن دارم

اِن تین غزلوں کے علاوہ حافظ نے حاجی قوام کا ذکر ایک بار تو اُس قطعہ میں کیا ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے اور دوسری بار حاجی قوام کی تاریخ وفات کا

---

[1] حسین پژمان کا قول ہے کہ یہ مصرع فنادی غزنوی کا ہے اور خواجہ حافظ نے اس کی تضمین کی ہے

بجان خریده ام او را دین نمید انم
که این معامله در خواب یا به بیداریست

اگر (ترانه) گلستان منظر خوبان
نظر به غنچه دهانی و لالہ خساریست

گمان مبر که مرا به ریاض دوست
نظر به نقطہ مشکین و خط زنگاریست

که چشم اہل نظر بر مجاری قلمیست
که در انامل ابداع حضرت باریست

جفای دوست بغایت رسید و میترسیم
که انتہای جفا ابتدای بیزاریست

فرد گرفته فضایش ہوای خانہ دل
چناں چہ مدخل روح ابدران شواریست

عماد در راہ او جانی سپارد شکر گزار
که جان سپردن ما در رہ طلبگاریست

گذشتہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے کہ عبید زاکانی حافظؒ کا ہم عصر شاعر تھا، اور شیراز کا سفر ہی نہیں بل کہ وہاں تحصیل علم بھی کر چکا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عبید زاکانی کی مشہور مثنوی موش و گربہ کا اشارہ عماد الدین ہی کی طرف ہے چوں کہ اس نے صریحاً کرمانؔ کا نام لیا ہے

از قضای فلک یکی گربہ
بود چون از دہا بکرمانا

بہر صورت ہم نے اِن تمام اشارات کا ذکر کیا ہے جو حافظؒ کے شعر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک اشارہ کو ختمی طور پر قبول کرنا اشتباہ سے خالی نہ ہوگا جب تک اس ضمن میں زیادہ مستند اور واضح دلائل سامنے نہ آجائیں۔

۱۲۔ حاجی قوام الدین

اپنے وقت کے جن لوگوں کی تعریف حافظؒ نے کی ہے اُن میں حاجی قوام الدین کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حافظ نے ایک قطعہ میں شاہ شیخ ابواسحاق کے زمانے میں ملک فارس میں پانچ اعلیٰ شخصیتوں کے نام لیے ہیں۔ اور اُن میں حاجی قوام الدین بھی شامل ہیں۔

بہ عہد سلطنت شاہ شیخ ابواسحاق
بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

ساز چنگ آہنگ عشرت صحن مجلس جای رقص
خال جانان دانہ دل زلف ساقی دام راہ

دور از ین بہتر بناشد ساقیا عشرت گزین
حال ازین خوشتر بناشد حافظا ساغر بخواہ

اس غزل میں حاجی قوام الدین کی طرف اشارے کا مفروضہ اس دلیل پر ہے کہ اس قطعہ میں اور اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے۔

عشق بازی و جوانی وشراب لعل فام

اور جس میں حاجی قوام کا نام صراحت سے لیا گیا ہے۔ مضمون اور محیط میں بڑی شباہت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

حاجی قوام الدین کا ذکر تذکروں میں آیا ہے، اِن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظؔ نے نہ ازروے مبالغہ بلکہ ازردے حقیقت اس کی تعریف میں کہا ہے۔

دریای اخضر فلک وکشتی ہلال ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

شیخ قوام شیراز کے ایک قدیم اور بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر شیخ شاہ ابواسحاق کا وزیر بنا اور شاہ اسحاق کے خاندان کا خاص دوست تھا۔ بل کہ اسحاق کے شیراز پر حملہ اور اپنی سلطنت کو وہاں محکم بنانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ علاوہ ازین شیراز کے لوگوں میں اس کا بڑا رسوخ تھا۔ وہاں کی خوشحالی اور ترقی پر بطور خاص توجہ دیتا تھا۔ اور اپنی داد و دہش کی بنا پر شیراز کے

درج ذیل قطعہ ہے۔

سرور اہل عمایم شمع جمع انجمن
صاحب صاحبقران خواجہ قوام الدین حسن

سادس ماہ ربیع الآخر اندر نیمروز
روز ادینہ بحکمِ کردگار ذوالمنن

ہفت و پنجاہ چار از ہجرت خیر البشر
مہر را جوزا مکان و ماہ را خوشہ وطن

مرغ روحش کو ہمای آشیان قدس بود
شد سوی باغ بہشت از دام این دار محن

علاوہ ازین ایک اور قطعہ ہے جس میں حافظ نے اگرچہ صراحت سے حاجی قوام الدین کا نام نہیں لیا ہے تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسی سے متعلق ہونا چاہیے۔ قطعہ یہ ہے۔

ساقیا پیمانہ پُرکن زانکہ صاحب مجلست
آرزو می بخشد و اسرار میدارد نگاہ

جنت نقد ست اینجا عیش و عشرت تازہ کن
زانکہ در جنت خدا بر بندہ ننوسید گناہ

الکرم افتخار زوار البیت والحرم اولا البرتبہ بکار الا
خلاق واشم الفایز بمعنا یتۃ اللہ باد کرامت وادنی نعم
......''

یورپ میں شاہنامہ فردوسی کا ایک نسخہ ایک شخص بنام مسٹرا یچ ۔ نیور (H.Never) کی ملکیت ہے ۔ یہ علامہ قزوینی کی نظر سے گزرا ہے۔ یہ ماہ رمضان ۷۴۱ھ ہجری میں اسی حاجی قوام الدین حسن کے لیے لکھا گیا تھا۔ نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

''تمام شد کتاب شاہنامہ فردوسی بہ فرخی و فیروزی علی
یدا ضعف عباللہ وا جو جھم حسن بن محمد بن علی حسینی
مشتہر بموصلی اصلح اللہ عاقتبہ فی یوم الاثنین عشرین
ذی قعدہ سبہ احدی واربعین وسبعمایہ ولہجہ یہ''

حاجی قوام کی علم دوستی بزرگ منشی اور علومرتبت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ زرکوبی نے شیراز نامہ کواسی کے نام سے معنون کیا ہے۔ اسی حاجی قوام کے احفاد میں ایران کا ایک نامور فیلسوف محمد ابراہیم بن یحیٰ گزرا ہے جس کو ایرانی تاریخ فلسفہ وادب کے عالم ملا صدرا شیرازمی کے نام سے جانتے ہیں ملا صدرا شیخ بہائی، میر، داماد اور میر فندرسکی جیسے عظیم فیلسوفوں کا شاگرد تھا۔ اس کی سو سے بھی زیادہ تالیفات ہیں جن میں کوئی بھی ایک اس کی عظمت اور اس کے مقام کو ذہن نشین کروانے کے لیے کافی ہے ۔ اس کے شاگردوں میں ملا محسن فیض کاشانی اور ملاعبدالرزاق لاہیجی شامل ہیں۔ تحصیل علم کے بعد صدرا شیراز واپس آیا اور مدرسہ خان میں درس دیتا رہا۔

اس مدرسہ کے بڑے دروازے کے سامنے ایک کمرہ تھا جس میں وہ درس دیا کرتا تھا۔ ۱۳۳۷ھ ہجری شمسی میں اس کمرہ کی جگہ ایران کی وزارت تعلیم کی

عوام میں مقبول ہوا تھا۔ وہاں کی حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ چناں چہ روضتہ الصفا میں درج ہے کہ مظفریوں نے جب شیراز کا محاصرہ کیا تو شاہ شیخ ابواسحاق نے کہا

آل کار من با محمد مظفری چیست ؟

حاجی قوام نے جواب دیا:۔

تا من زندہ باشم باکی نداشتہ باش۔''

حاجی قوام کا ذکر محمود گیتی نے تاریخ خاندان آل مظفر میں بھی کیا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت پر پوری روشن زرکوبی نے شیراز نامہ کے مقدمہ میں ڈالی ہے۔ خود اس کی مقدمہ کی متعلقہ عبارت بڑی دل چسپ ہے۔ اس لیے ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں۔

''......بی عنایتی اہل زبان درحق ہنرمندان و یاس از ینکہ صاحب ہمتی و ہنروری از بنای فارس را یابم کہ کتاب خود را باد تقدیم کنم۔ ناگہان خرد خردہ بین کہ فارس میدان فراست است نقش کعبتین اندیشہ از لوح تفکر برخواندہ

ببین در آستان صفدر ملک	ببین برا استان صفدر جود
جہاں چشمت و خورشید رفعت	گل باغ مکارم عبہر جود
مدِار دولت و کان مرّوت	سپہر مہر سایہ گستر جود
ہمای دولت آثارش چو سیمرغ	بگسترده بگیتی شہپر جود
قوام دولت و دین شمع اقبال	محیط بحر کف و گوہر جود

صاحب اعظم افخم دستور اعدل اکرم والی خطہ الجودو

جامی کی نفحات الانس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دن شاہ شجاع نے حافظ کی غزلوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی کوئی غزل مطلع سے مقطع تک ایک ہی نہج پر نہیں ہوتی۔ چند بیت شراب کی تعریف میں، چند تصوف میں اور ایک دو معشوق کی توضیف میں ہوتے ہیں۔

حافظ نے جواب میں کہا کہ آپ کا فرمانا بجا، لیکن اس نقص کے باوجود میرے اشعار اطراف آفاق میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ جب کہ حریفوں کی غزلیں اور نظمیں دروازۂ شیراز سے باہر نہیں پہنچتیں۔

اس کنایہ سے شاہ شجاع چراغ پا ہو گیا اور حافظ کو اذیت پہنچانے کی غرض سے اس کی ایک غزل کے اس بیت پر شدید اعتراض کیا۔

گر مسلمانی از آنست کہ حافظ دارد
وای اگر پس امروز بود فروائی

اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ قیامت کے دن مُردوں کے اُٹھ کھڑا ہونے کے قائل نہیں۔ بعض حاسدوں نے یہاں تک ٹھان لی کہ ایک فتویٰ جاری کریں کہ روزِ اجزا پر شک کرنا کفر ہے اور حافظ کے اس بیت سے روزِ جزا کے بارے میں شک کی بو آتی ہے۔

حافظ سخت مضطرب ہوئے اور مولانا زین الدین تائیباری سے جو ان دنوں عازم حج تھے اور شیراز میں قیام پذیر تھے، جا ملے۔ سب کیفیت بیان کی، اور حل کی راہ چاہی۔ مولانا نے فرمایا کہ مقطع سے پہلے ایک بیت لگا دو فلاں شخص یوں کہہ رہا تھا۔ یعنی ''نقل کفر، کفر نہ باشد''۔ اس طرح تہمت سے بچ سکتے ہو۔ اس مشورہ کو نظر میں رکھتے ہوئے حافظ نے مقطع سے پہلے یہ شعر بڑھایا:

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت
بر در میکدہ با دف دنی تر سائی

نگرانی میں ایک بڑا ہال تعمیر کیا گیا۔ جس کا نام تالار ملا صدرا رکھا گیا۔ ملا صدرا ساتویں بار پیدل حج کے دوران بصرہ میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوا۔ ملا صدرا پر مزید اطلاع مجھے تہران یونی ورسٹی میں کسب علم کے دوران فلسفہ کے استاد ڈاکٹر نصر کے درس میں ملتی رہی۔ جس کو ضبط کر چکا ہوں اور فرصت ملنے پر اس کو شائع کیا جائے گا۔

علمائے شیراز کا ذکر کرتے ہوئے صاحب فارس نامہ ناصری نے ملا صدرا کے بارے میں لکھا ہے۔

"مولانا صدالدین محمد معروف نہ صدر المتالہین مشہور بہ آخوند ملا صدرا خلف الصدق مولانا ابراہیم قوامی وشیرازی وحضرت سید علی خان قدس سرہ در کتاب سلافتہ العصر فرمودہ است مولانا صدرالدین محمد بن شیرازی مشہور بہ ملا صدرا در بصرہ زمان توجہ او برای حج در عشر خامس از ماہ حاوی عشر وفات یافت وجناب ملا صدرا را قوامی بر آن گویند کہ گویا از سلالہ وزیر بی نظیر حاجی قوام الدین حسن شیرازی بودہ کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمہ فرمودہ است۔"

دریای اخضر فلک وکشتی ہلال مستغرق نعمت حاجی قوام

۱۳۔ شیخ زین الدین ابوبکر تایبادی

تائیب آباد خراسان کے ایک قصبہ کا نام ہے اور شیخ ابوبکر تایبادی اسی قصبہ کا رہنے والا تھا۔ حافظ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت اس شخص کا نام ایک دل چسپ قصہ کے دوران آتا ہے۔ تذکرہ حبیب السیر کے موئف خواندمیر نے مولانا

ت تابنیادی کے درمیان ملاقات کے دل چسپ واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس کو ہم اختصار کے ساتھ درج کریں گے۔

''........... اول ذی الحجہ ۷۸۲ ہجری میں تیمور کو سویہ کے قصبہ آ پہنچا اور وہاں سے تائیباد کا رُخ کیا۔ مولانا نازین الدین تایبادی کا مسکن تھا۔ خواص میں سے کسی نے مولانا کے پاس از طریق ادب آدمی بھیجا کہ امیر تیمور آپ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔ مولانا نے جواب میں کہلوایا کہ میرا امیر تیمور کے ساتھ کوئی کام نہیں۔ مولانا کا یہ جواب سُن کر میرا تیمور خود مولانا کے حجرے کی طرف چلا آیا۔''

حافظ ابرو نے آگے چل کر لکھا ہے کہ امیر تیمور نے مجھ سے کہا۔

مجھے جب سے حکومت اور سرداری ملی ہے تب سے زاہدوں، عابدں، اور گوشہ نشینوں کے ساتھ ملاقات میں مجھ پر اُن کا رعب اور ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ البتہ مولا زین الدین تائیبای سے مل کر مجھے کوئی ایسا احساس نہیں ہوا۔ وہ حق گو آدمی ہے اور لوگوں سے کنارہ کر چکا ہے۔ ملاقات کے وقت اُس نے کئی اچھی نصیحتیں کیں۔ وعظ کے دوران میں (امیر تیمور) نے اُس سے پوچھا کہ آپ اپنے بادشاہ ملک محمود کو کیوں نصیحت نہیں کرتے، شراب پیتا ہے اور لہو ولعب میں مشغول رہتا ہے۔ مولانا نے کہا میں نے اُسے سمجھایا تھا نہیں مانا، خدا تعالٰی نے آپ کو بھیجا کہ آپ اس کی

اصل موضوع سے ذرا ہٹ کر ہم یہاں درج کرنا چاہتے ہیں کہ بقول استاد علی اصغر حکمت ان کے پاس مولانا جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ ہجری) کے رسالوں کا ایک مجموعہ ہے جن میں اہم چار رسالوں میں حافظ کی درج ذیل غزل کی تشریح کی گئی ہے۔ لیکن دیوان حافظ میں یہ غزل موجود نہیں

خوشتر از کوی خرابات نباشد جائی
گر بہ پیرانہ سرم دست دہد ماوائی

چہ کنم گوش کہ درد ہر چو من شیدائی نیست
نیست این جز سخن بوالہوسی رعنائی

با ادب باش کہ ہر کس نتواند گفتن
سخن پیر مگر برھمنی دانائی

رحم کن بر دل مجروح خراب حافظ
زانکہ ہست از لی امروز یقین فردائی

نفحات الانس اور حبیب الیسر کے علاوہ عرفات العاشقین میں بھی یہ قصہ درج ہوا ہے اور شرف الدین علی یزدی اور حافظ ابرو دونوں نے مولانا ابوبکر تائیبادئی کا ذکر اور تیمور کے شرح حال کے دوران کیا ہے۔ اس سے ہمیں مولانا مذکور کے علم و دانش اور اِن کی بزرگی کے بارے میں قابل اعتبار اطلاع ملتی ہے۔ بل کہ اس داستان کو قبول کرنے میں دل چسپی لیتے ہوئے علی یزدی لکھتا ہے۔

"..........وصاحبقران وین پرور پاک اعتقاد بہ عزم زیارت مولانا اعظم اورع زین الدین تائیبادئی کہ از علما متورع آن روزگار بود بہ تائیب آباد و نزول فرمود بہ صفای نیت دخلوص طویت صحبت ان یگانہ روزگار یافت۔"

(ظفر نامہ جلد اوّل صفحہ ۱۲۔۱۳

حافظ ابرو نے جغرافیائی تاریخی میں امیر تیمور اور مولانا زین الدین

رخ نے اِن کے مزار پر ایک وسیع ایوان بنوایا تھا۔

امیر تیمور

خواجہ حافظ شیرازی اور امیر تیمور کی شیراز میں ملاقات کا ذکر کئی تذکروں میں آیا ہے اور اُس کے ساتھ حافظ کا یہ شعر یاد کیا جاتا ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہند ویش بخشم سمر قند و بخارا را

گزشتہ اوراق میں اس طرح کے کچھ قصوں کو درج کیا گیا ہے۔ یہ حکاتیں داستانیں اور افسانے غلط ہوں یا سچ بادی النظر میں کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔ لیکن افسانے تو کیا کوئی بھی چیز اپنے محیط زمان اور اوضاع سے الگ کر کے دیکھی جائے تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ چوں کہ ہم حافظ کے بارے میں کسی بھی واقعہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے ظاہر ہے ہم اِن قصوں کی تحلیل اور تحقیق نہ صرف دل چسپی کا باعث خیال کریں گے بل کہ ہر حال میں ہم اِن کو اہم سمجھیں گے۔ خواجہ حافظ کے بارے میں جتنی بھی داستانیں مشہور یا غیر مشہور ہیں، اُن کی پڑتال کرنا اور اِن کی درستی پر بحث کرنا ہمارا پسندیدہ کام ہے۔

بہر کیف شہر مذکور کے ساتھ تعلق رکھنے والے قصہ کو تذکرۃ الشعرا تالیف دولت شاہ سمرقندی، لطائف الطوائف تالیف فخر الدین صفی روضہ الصفا تالیف میر خواند اور حبیب السیر تالیف خواند میر میں خفیف اختلاف کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ ۷۹۵ھ ہجری میں تیمور نے شیراز کو فتح کر کے شاہ منصور کا خاتمہ کیا اور پھر حافظ کو بلا کر پوچھا کہ میں نے ہزاروں شہروں کو ویران کیا تا کہ اپنی زادگاہ اور اپنے وطن سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ایک خال سیاہ کے عوض میں انھیں

تنبیہ و تادیب کریں، آپ کو نصیحت کرتا ہوں، اگر
آپ نہ مانیں تو خدا تعالیٰ کسی دوسرے کو بھیجے گا۔ جو
آپ کی تنبیہ و تادیب کرے گا۔

امیر تیمور یہ نصیحتیں سن کر حیران و ششدر رہ گیا اور مولانا کو وداع کر کے ہرات کی طرف چلا گیا[1]۔

حسین پژمان نے دیوان حافظ کے مقدمہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور حاشیہ پر اضافہ کیا ہے کہ شیخ زین الدین ابوبکر تائیبای ہراتی نظام الدین ہروی کا شاگرد تھا۔ اُسی کے وجود بابرکات کی بنا پر تائیباد تیمور کی خونریزی سے بچ گیا۔ اُس کی اور حافظ کی وفات ایک ہی سال یعنی ۷۹۱ ہجری میں ہوئی جیسا کہ اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے

تاریخ وفات قلب اوتاد

یک نقطہ بہنہ با خر صاد

خواند میر نے ''حبیب السیر'' میں اس ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا زین الدین سے ملاقات کے دوران جب اس بزرگ نے تیمور سے کہا کہ اگر تم بھی نصیحت نہ مانو گے تو خدا تعالیٰ کسی دوسرے شخص کو تم پر غالب کرے گا

تیمور نے پوچھا، وہ کون ہوگا جو مجھ پر غالب آئے گا مولانا نے فرمایا عزرائیل

یہ سن کر تیمور خوش ہوا کہ انسانوں میں سے اس پر کوئی غالب نہیں ہوسکتا مولانا کی بات کو فال نیک سمجھا۔

ملک عماد الدین زوزنی نے مولانا زین الدین کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے ۷۹۱ ہجری حاصل ہوتا ہے مولانا یوسف آباد میں جو تربت جام سے چند میل کی دوری پر واقع ہے، دفن ہوئے۔ تیمور کے بیٹے شاہ

---

[1] ''جغرافیائی تاریخی'' تالیف حافظ ابرو قلمی نسخہ آقای مدرس رضوی تہران۔ ص ۲۰۹ جلد دوم

لکھا ہے۔ اس نے آگے چل کر کہا ہے کہ یہ شخص شاہ شیخ ابواسحاق کے خاندان سے میں تھا۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ کسی شخص نے اس رسالہ کے قلمی نسخہ کو فروخت کرنے کی غرض سے کتاب خانہ ملی تہران میں پیش کیا۔ ماموریں نے اسے ملاحظہ کے لیے علامہ قزوینی کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے مطالعہ کے دوران حافظ سے متعلق زیر نظر حکایت کو بطور یاداشت نقل کیا جس کو عیناً درج کیا جاتا ہے۔ چوں کہ یہ عبارت دولت شاہ سمرقندی کے بیان سے کچھ اختلاف رکھتی ہے۔ اس لیے اسے یہاں نقل کرنا مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

''.........در زمان نزول رایات سلطان جہانیان و پادشاہ جہانبان امیر تیمور گورکان وایام انقلاب دولت سلطان زین العابدین براہل شیراز امانی مقرر کردند و چون حافظ شاعریکی ارباب تاہل بود و خانہ داشت از محلّہ او از ان جملہ مقداری بنام او بنوشتند بہ محصل حوالہ کردند در۔ اثنا این حال بد پناہ بہ امیر مذکور بردد و اظہار افلاس و بی چیزی نمود، امیر مشار الیہ فرمودند تو گفتہ ای۔

اگر ان ترک شیرازی بدست آرو دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

کسی کہ سمرقند و بخارا بہ یک خال بخشد مفلس بنا شد۔ حافظ گفت از ین بخشند گیہا مفلسم۔ پس آنحضرت بہ سبب این جواب بر بدیہہ، آن وجہ را راجع فرمود ومشار الیہ خلاص گشت۔''

ایک مختصر سی داستان سے ایک دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

اول یہ کہ تیمور نے شیراز فتح کرنے کے بعد شہر کے لوگوں پر ٹیکس لگایا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے والوں کی فہرست میں حافظ کا نام بھی شامل تھا۔

دوم یہ کہ حافظ متاہل تھے، اور ان کا اپنا مکان شیراز کے کسی محلّہ میں تھا۔

سوم یہ کہ غالباً یہ ٹیکس اُن ہی لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جو ادا کرنے کی

بخش دو گے[1]۔

حافظ نے کورنش بجالا کر کہا

''بادشاہ سلامت! انہی بخششوں کا نتیجا ہے کہ اس حال میں پڑا ہوں''

امیر تیمور کو یہ لطیفہ پسند آیا اور حافظ پر عنایت اور نوازش کی۔

دولت شاہ نے یہ قصہ ۷۹۵ھ ہجری کا بتایا ہے اور آگے چل کر حافظ کا سال وفات ۷۹۴ھ ہجری درج کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس غلطی کی بنا پر حافظ اور امیر تیمور کے درمیان ملاقات کی صحت کو شک و تردید کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ لیکن دراصل شک اس بات پر نہیں کہ یہ ملاقات رونما ہوئی تھی یا نہیں۔ شک یہ ہے کہ ملاقات نہ تو ۷۹۴ھ ہجری میں رونما ہوئی اور نہ ۷۹۵ھ ء میں۔ امیر تیمور کے دوسرے حملے یعنی ۷۹۵ھ ء میں ہی شاہ منصور قتل ہوا اور شیراز میں آل مظفر کا خاتمہ ہوا۔ چوں کہ حافظ کی وفات ۷۹۱ھ ہجری یا ۷۹۲ھ ہجری میں واقع ہوئی تھی اس لیے ظاہر ہے۔ اگر امیر تیمور اور حافظ کی ملاقات ہوئی بھی ہو تو ۷۸۹ھ ہجری میں ہوئی ہوگی۔ اس نتیجہ کی تصدیق تذکرہ الشعرا سے بہت پہلے ایک رسالہ ''انیس الناس'' تالیف سنجانی شیرازی میں درج عبارت سے ہوتی ہے۔ یہ رسالہ ۸۲۰ھ ہجری میں موئف مغیث الدین ابوالفتح ابراہیم سلطان شاہ رُخ سلطان بن امیر تیمور کے لیے لکھا گیا تھا۔

ہاشم رضی نے سنجانی شیرازی لکھا ہے لیکن ڈاکٹر قاسم غنی نے شجاع شیرازی

---

[1] پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ اُس نے ایران میں اپنے قیام کے دوران سنا کہ حافظ نے تیمور کو بتایا تھا کہ اصل شعر میں تحریف کی گئی ہے جو یوں تھا ۔ اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را بخال ہندویش بخشیم سہ من قند و دو خرما را حکمت نے اس ضمن میں کہا ہے کہ یہ بُری عامیانہ روایت ہے اور ممکن ہے کہ کسی نے مزاح کے طور پر پر براؤن کو مصرع بدل کر سُنایا ہو۔ چناں چہ شیراز میں ایسی کوئی حکایت مشہور نہیں (حاشیہ سعدی یا جا

جنابذی کی وساطت سے حافظؔ تیمور کے سامنے پیش ہوئے۔ سید تیمور کے خاص مقربوں میں سے تھے۔ کیوں کہ مجمل فصیحی میں سال ۸۲۸ھ ہجری کے حوادات کے ذکر میں درج ہے کہ تیمور نے دیوان حضرت اعلا کا منصب سید زین الدین جنابذی کو دیا تھا۔ اور دوسری طرف حافظؔ کے ساتھ اُس کے روابطہ دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ اس نے بیچ بچاؤ کیا ہو۔ حافظؔ اور سید مذکور کے باہمی اخلاص کا پتہ مجمل فصیحی کی ایک اور حکایت سے چلتا ہے ۸۰۷ھ ہجری میں خواجہ احمد طوسی جو ہرات کا حکمران مقرر کیا گیا وہاں کے لوگوں کے ساتھ بداخلاقی کا سلوک کرنے پر افسوس کرتے ہوئے سید زین الدین نے تبریز سے ایک خط خواجہ احمد کے نام بھیجا جس میں حافظ کا یہ شعر درج تھا۔

چشمت بہ عشوہ خانہ مردم خراب کرد

مخموریت مباد کہ خوش مست میردی

تیمور مظفری خاندان اور حافظ کے سہہ گانہ روابطہ کے بارے میں ہم اس کتاب کی اگلی فصل میں کچھ اور ذکر کریں گے۔

سلاطین اور وزرا کو چھوڑ کر دیوان حافظ میں خواجگان شیراز میں سے کچھ اور شخصیتوں کے نام نظر آتے ہیں مثلاً شاہ نعمت اللہ شاہ داعی، خواجہ عماد الدین محمود اور کمال الدین ابوالوفا۔ اوّل الذکر کے بارے میں بیشتر اطلاع شاہ شجاع اور حافظؔ کے درمیان روابط پر بحث کے دوران زیر نظر لائی جائے گی۔ لیکن قوام الدین ابوالوفا کے بارے میں صرف ایک شعر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

وفا از خواجگان شہر با من

کمال ملت و دین بوالوفا کرد

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حافظؔ کی اس مطلع کی غزل کا اشارہ دراصل نعمت اللہ ولی کی طرف ہے۔

استعداد رکھتے تھے۔ استعداد ادائیگی کے لیے متاہل اور خانہ وار ہونا، شرطیں تھیں۔ ''چوں ...... داشت'' والی عبارت سے ایسا ہی مستفاد ہے۔

لطیفہ کے لیے تیسری قابل اعتبار سند لطائف ہے جسے فخر الدین علی صفی نے ۹۳۰ ہجری میں شاہ محمد سلطان کے لیے لکھا تھا۔ اس کتاب کے نویں باب میں موئف نے سید زین الدین جنابزی کے ذریعہ حافظؔ کی دربار تیموری تک رسائی اور پھر لطیفہ کے واقع ہونے کی داستان درج ہے ایسا لگتا ہے۔ کہ دولت شاہ سمرقندی نے اسی کتاب سے اصل حکایت نقل کی ہو، کیوں کہ دونوں میں بڑی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔

بہر کیف اِن تمام شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حافظ اور تیمور کے درمیان ملاقات رونما ہوئی ہوگی اور لطیفہ زیر بحث بھی معرض وجود میں آیا ہوگا۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ امیر تیمور فارسی سمجھنے کے علاوہ فارسی بول بھی سکتا تھا چناں چہ ابن عربشاہ نے اپنی کتاب ''عجائب المقدور'' میں بتایا ہے کہ تیمور فارسی زبان اچھی طرح جانتا تھا۔ قصص الانبیا اور سیر الملوک سے بڑی رغبت رکھتا تھا۔ سفر اور حضر میں تاریخ اس کے سامنے پڑھی جاتی تھی۔ جو فارسی زبان ہی میں ہوا کرتی تھی۔ عرب شاہ کی عین عبارت یوں ہے۔

''............دکان امیا لایقرا شیارہ یکتب ولا یعرف شیاً
من عربیہ ویعرف من اللغات انفارسیہ واکیہ والمغویۃ''۔

قبل ازین کہ حافظؔ کے شعر سے متعلق ہم اپنی اطلاعات ختم کریں ایک اور نکتہ کی طرف توجہ دینا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گمان ہے کہ ترک شیرازی سے حافظؔ کا اشارہ شاہ شجاع کے بیٹے زین العابدین کی طرف ہو۔ ممکن ہے کہ تیمور اس کنایہ کو بھانپ گیا ہو، تب ہی تو حافظ کر بلا کر باز پرس کی ہوگی۔ اس صورت میں لطایف الطّوایف کی متعلقہ عبارت کو تقویت ملتی ہے یعنی یہ کہ سید زین الدین

اور جب ایک سو تین کو تین بارہ گیارہ سو سے نکالیں تو باقی ۷۹۱ھ رہ جاتا ہے۔

(۳) لطف علی بیگ آذر نے آتش کدہ آذر میں تاریخ وفات ۷۹۱ھ ہجری بتائی ہے۔

(۴) رضا قلی خان ہدایت نے ریاض العارفین اور مجمع الصفحا میں ۷۹۱ ہجری بتایا ہے۔

(۵) تقی کاشی نے خلاصہ الاشعار و زبدۃ الافکار میں ۷۹۱ھ ہجری ضبط کیا ہے۔

(۶) دیوان حافظؔ کے بعض نسخوں کے مقدمہ میں جو گلندام سے منسوب کیا جاتا ہے حافظؔ کے انتقال کے بارے میں یہ عبارت درج پائی جاتی ہے۔

"..........تاریخ احدی و تسعین سبعمایہ وویعت حیات بموکلان قضا وقدر سپرد" موخر الذکر سال وفات یعنی ۷۹۲ کو ضبط اور قبول کرنے کے لیے یہ شواہد ہیں

(۱) فصیحی خوافی نے مجمل فصیحی میں ۷۹۲ ہجری کے دوران رونما شدہ وقائع کے تحت حافظؔ کے انتقال کا واقعہ بھی درج کیا ہے۔ اس کی عبارت یوں ہے۔

اثنین و تسعین وسبعمائۃ ۷۹۲ مولانا اعظم افتخار الافاضل شمس الملۃ والدین محمد الحافظؔ شیرازی بہ شیراز مدفوناً بہ کت[1] درد تاریخ او گفتہ اند"

بسال ب وص و ذال ابجد	ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلیٰ روان شد	فرید عصر شمس الدین محمد

فصیحی خواجہ حافظؔ کی وفات کے وقت پندرہ سولہ برس کا نوجوان تھا اور

---

[1] کت بمعنی شہر ملاحظہ ہو "محیط واحوال واشعار رودکی" از استاد سعید نفیسی صفحہ ۱۵۰ + کت یا کنت یا کند یا قند اسم خاص ہے جو پسوند کے طور پر استعمال ہوتا ہے مثلاً سمرقند عربی میں "قط" کی صورت میں آیا ہے مثلاً مسقط

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمی بما کنند

ماخاک راہ را بنظر کیمیا کینم
صد درد را بگوشۂ چشمی دوا کنیم

۱۵۔ انتقال:۔

حافظ کے سال وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے درمیان ایک سال کا فرق پڑتا ہے۔ بعض نے ۷۹۱ ہجری ضبط کیا ہے اور بعض نے ۷۹۲ ہجری اول الذکر قول کے لیے مندرجہ ذیل اسناد ہیں۔

(۱) اکثر دیوان حافظ کے نسخوں (چاہے قلمی ہوں یا چاپی) کے آخر میں مادہ تاریخ وفات میں مندرجہ ذیئل بے اساس قطعہ درج ہوا ہے۔

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ — کہ شمعی بود از نور تجلّٰی
چودر خاک مصلی یافت منزل — بجوتاریخش از خاک مصلّٰی

یہ قطعہ حافظ کے سنگ مزار پر کندہ کرایا گیا ہے اور خاک مصلی کی ترتیب مادہ تاریخ کے لیے زبان زدعام ہوگئی ہے۔

مسٹر ہرمن بیکنل Herman Bicknell نے حافظ شیراز Hafiz of Sheraz کے عنوان سے اپنی کتاب میں متذکرہ بالا مادہ تاریخ کو انگریزی زبان کے ایک مصرع میں بطور ابجد ضبط کیا ہے۔

Thrice take earth from mosallas esrth its richest Grains

کلمہ:۔ Mosallas earth کے لاطینی ہندسوں M+L+L کا مجموعہ ۱۱۰۰ اور کلمہ Its richest Grains کے لاطینی ہندسوں سے ۱۰۳ نکلتا ہے

تنگ اجل بیرون برو ودروح پاکش با ساکنان عالم
علوی قرین شد و ہمخوابہ پاکیزہ رویان حور العین
گشت ......''

اِن تمام شواہد کے پیش نظر ۷۹۲ ہجری کو ہی حافظؔ کا سال وفات خیال کرنا چاہیے۔ خاک مصلیٰ والے مادہ تاریخ کی بے بنیادی پر کوئی شک نہیں بل کہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصلیٰ سے حافظؔ کی محبت اور گلگشت وغیرہ اور اخرکار مصلیٰ میں ہی اس کی آرام گاہ کی مناسبت سے بھی اس قطعہ کے گمنام شاعر نے خاک مصلیٰ کو مادہ تاریخ بنایا اور ایک سال کے فرق کو نظرانداز کر دیا۔ البتہ ایسا کرنے والا اپنے مقصد میں بے شک کامیاب ہوا، کیوں کہ خاک مصلیٰ ہی خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

حافظؔ کا انتقال یقینی طور پر شیراز میں ہوا تھا۔ اور آرام گاہ حافظؔ کے بارے میں ہم نے پہلے باب میں پوری تفصیل درج کی ہے۔ جس کا اعادہ کرنا غیر ضروری ہے۔ البتہ اس ضمن میں تحقیق کے بعد ایک اور دل چسپ موضوع ہمارے سامنے آما ہے۔ جس پر چند سطور درج کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

دیوان حافظ کے مقدمہ کو محمد گلندام سے نسبت دی جاتی ہے۔ مقدمہ نویس نے خواجہ حافظؔ کے القاب میں منجملہ دیگر صفات و مشخصات ''المرحوم الشہید'' بھی لکھا ہے متعلقہ عبارت یہ ہے۔

''............ ذات ملک صفات مولانا الاعظم السعید
المرحوم الشہید مفخر العلما استاد بخار الادیا۔ معادالللط انف
الروحاینہ الحافظ شیرازی بود۔''[1]

علامہ قزوینی نے کہا ہے کہ اُس کے پاس موجود یا زیر نظر گیارہ قلمی نسخوں

---

[1] از سعدی تا جامی۔ ص ۳۸۵

اس لحاظ سے حافظ کے زمانہ کے بہت قریب تھا۔

(۲) جامی نے نفحات الانس میں حافظؔ کی وفات کو بڑی صراحت اور بغیر کسی نقل قول کے اثنین وتسعین وسبعمائۃ (۷۹۲ھ) ہجری درج کیا ہے۔ جامی حافظ کی موت کے صرف پچیس سال بعد ۸۱۷ھ ہجری متولد ہوا تھا۔ وہ بھی حافظ کا قریب العصر تھا۔

(۳) خواند میر نے بھی حبیب الیسر میں صریحاً اور بغیر کسی نقل قول کے ۷۹۲ ہجری بتایا ہے۔

(۴) قاضی نوراللہ شوشتری نے مجالس المومینن میں ۷۹۲ ہجری درج کیا ہے

(۵) ملا سودی نے دیوان حافظ کی ترکی زبان میں اپنی مشہور شرح میں سال وفات ۷۹۲ھ ہجری بتایا ہے

(۶) حاجی خلیفہ نے کشف انطنون میں ۷۹۲ھ ہجری درج کیا ہے۔

(۷) دیوان حافظ کے دو مستند ترین اور قدیم ترین قلمی نسخوں[۱] (یعنی رشید یاسمی اور ملک) میں محمد گلندام سے منسوب مقدمہ میں خاک مصلیٰ والا مادہ تاریخ کا قطعہ شامل نہیں۔ برعکس اِن میں واضح طور اثنی وتسعین وسبعمائۃ (۷۹۲ھ) اور پھر تاریخ وفات میں وہ قطعہ درج ہے جو مجمل فصیحی میں آیا ہے مقدمہ کی عبارت یوں ہے۔

"در تاریخ سنۂ اثنی وتسعین وسبعمائۃ وو یعت حیات بموکلان قضا وقدر سپرد درخت وجود واز دہلیز

---

[۱] اس مقولہ کی تمام تر ذمہ داری علامہ قزوینی اور ڈاکٹر غنی پر عائد ہوگی۔ انہی دونسخوں کو خاص کر سامنے رکھ کر حافظ کا مستند نسخہ تیار کیا تھا۔

[۲] ایضاً

تاب نہ لا کر انہی ایام میں رحلت کر گئے۔ اسی لحاظ سے مقدمہ میں المرحوم الشہید''
کی اصطلاحیں لائی گئی ہیں۔ صاحب عرفات لکھتا ہے کہ شاہ شجاع نے اس کی صرف
تنبیہہ ہی نہیں کی بل کہ '' دیارِ عدم'' میں بھیجنے کا بھی ارادہ کیا۔ اس بیان کو جب
فرصت کی عبارت کے ساتھ تطبیق دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے خواجہ
صاحب نے جسمانی چوٹیں کھا کر چند دنوں کے اندر رحلت کی ہو اور شہادت کا درجہ
پایا ہو۔ لیکن اس استنباط کو قبول کرنے میں ایک مشکل پیش آئی ہے۔ شاہ شجاع پر
تہمت لگانے میں بڑی نادرستی یہ ہے کہ شاہ شجاع حافظ سے پانچ یا چھ سال پہلے ہی
فوت ہو چکا تھا اور حافظ نے اس کی وفات پر مادہ تاریخ بھی کہا۔ صاحب
عرفات کا کہنا ہے کہ '' درآن ایام بجوار ایزدی پیوست'' چھ سال کی مدت کے لیے
استعمال نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یا تو داستان سراسر غلط ہے یا یہ کہ تنبیہہ کرنے والا اور
چوب زنی کرنے والا شاہ شجاع نہیں بل کہ کوئی دوسرا سلطان تھا۔ چناں چہ فرصت
نے شاہ شجاع کا نام لیے بغیر '' بعض سلاطین'' لکھا ہے ممکن ہے صاحب عرفات کا
بیان درست ہو۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شاہ شجاع کے علاوہ کسی بھی
دوسرے سلطان نے حافظ کے اشعار پر نکتہ چینی نہیں کہ اور نہ ہی اُنھیں اس کی تنبیہہ
یا چوب زنی کا بہانہ بنایا۔ تذکرہ نویس متفق ہیں کہ خواجہ حافظؔ کے انتقال کے بعد
بادشاہ کو تاسف ہوا، اور اس نے حکم دیا کہ جہاں بھی کہیں حافظؔ کا شعر ملے اس کو پیش
کیا جائے۔ حوالہ کرنے والوں کو انعام ملے گا۔ صاحب عرفات نے
'' گر مسلمانی از آنست کہ حافظؔ دارد'' والے شعر کے متعلق جنجال اور زین الدین
ابوبکر تائیبادی کے ذریعہ خلاصی والی داستان کے بعد لکھا ہے لیکن دراثنای این
قضیہ عورات دی جمیع مسودات را پارہ کردہ بشتند دتا مبادا مضرتی از آنہا بوی
رسد بلی دوستان ناقصان را اثر ازین بہتر نباشد۔ خواجہ بعد ازین واقعہ بسیار متاثر
ومتالم گرویدہ دہمان ایام بجوار یزی پیوست۔ بعد از خواجہ معاندین از کردہ خود

میں سے سات میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ تذکرہ نویسوں نے غالباً اسی محمد گلندام کے مقدمہ کی عبارت کو نقل کیا ہے اور ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس مقدمہ کے علاوہ کوئی اور ماخذ اُن کی دسترس میں تھے یا نہیں۔ بہر حال محمد قزوینی نے ''الشہید'' کے بارے میں مقدمہ میں لکھا ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں ''الشہید'' لکھا گیا ہے۔ البتہ ایک حکایت کا بیان جو چند تذکروں میں درج ہے۔ اس ضمن میں بے سود نہ ہوگا۔

حافظؔ کی غزلوں پر شاہ شجاع کی نکتہ چینی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ حسین پژمان نے مقدمہ دیوان حافظ میں لکھا ہے کہ حافظ کے جواب سے جب شاہ شجاع کو اپنے قول کی تکذیب ہوتی نظر آئی تو اس نے ارادہ کیا کہ حافظ کی تنبیہہ کرے بل کہ اُسے ''دیارِ عدم'' میں بھیج دے۔ یہ مصیبت شیخ زین الدین ابوبکر تائیبادی کی نکتہ سنجی سے ٹل گئی۔ آگے چل کر یہی مقدمہ نویس عرفات العاشقین سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس پیر کامل کی رہنمائی سے حافظؔ پر کوئی آفت آنے نہ پائی اور شاہ شجاع کے حضور آسیب کے بغیر سے نکل آیا۔ اس قصہ کے دوران اُس کے گھر کی مستوارات نے تمام مسودوں کو پارہ پارہ کیا اور دھو ڈالا۔ تا کہ اُن سے کہیں اور مصیبت نہ آئے۔ خواجہ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ انہی ایام میں جوار یزدی سے پیوست گئے۔

فرصت نے اپنے تذکرہ دریای کبیر میں یہ عبارت لکھی ہے ''واین کہ گویند بعضی از سلاطین عصر خواجہ را چوب زدہ دیوانش را در آب افگند، پس از فوت خواجہ پشیمان شد۔''

صاحب عرفات العاشقین اور دریای کبیر کی عبارات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ غالباً شاہ شجاع کی طرف سے حافظؔ کی شدید تہدید کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ سخت غمگین ہو اور غالباً پیرانہ سالی میں اس ذہنی اور روحانی عذاب کی

رحلت سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ اُن میں ایک تو چھوٹی عمر ہی میں گذر گیا تھا۔ اس کو مکتب میں بٹھایا گیا تھا۔ مگر دست قضا نے اس غنچہ کو کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا چناں چہ:

دلا دیدی کہ آن فرزانہ فرزند   چہ دید اندر رخم این طاق رنگین
بجای لوح سیمیں در کنارش   فلک بر سر نہادش لوح سنگین

اسی فرزند یا شاید اُس کے علاوہ کسی اور کی المناک موت کا غم حافظ نے ایک غزل میں بیان کیا ہے۔

بلبلی خون دلی خورد و گلی حاصل کرد   باد غیرت بصدش خار پریشان دل کرد
طوطی ای را بخیال شکری ولخوش بود   ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد
آہ و فریاد از چشم حسود مہ و مہر   در لحد ماہ کمان ابروی من منزل کرد
قرۃ العین من آن میوۂ دل یادش باد   کہ خود آسان بشد و کار مرا مشکل کرد

دوسرے بیٹے کے متعلق ہماری اطلاع ایک قطعہ پر مبنی ہے۔

آن میوۂ بہشتی کآمد بدست ایجان   از کف چرا بہشتی در دل چرا نکشتی
تاریخ این حکایت گراز تو باز پرسند   سر جملہ اش فرد خوان از میوۂ بہشتی

اس سے سال ۷۷۸ حاصل ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ہماری توجہ شیراز سے چھپنے والے سال ۱۳۱۱ھ ہجری شمسی کے مجلّہ دختران نام کے رسالے کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیراز کے قریب درالسلم قبرستان میں ایک سنگ مزار ملا ہے جو غالباً حافظ کے بیٹے قطب الدین کی قبر پر ڈالا گیا تھا۔ اس پر تاریخ وفات ۷۸۴ھ کندہ کی گئی ہے۔ مجلّہ دختران کی عبارت یوں ہے۔

"دو سال قبل آقای شعاع شیرازی در قبرستان دار السلم سنگی یافتہ اند کہ روی آن عبارت وقطعہ ذیل منقور بود:

اور ادیبوں کی شخصی زندگی کے حالات تلاش کرنے میں غفلت سے کام لیتے ہیں۔ یہ شکایت بسا اوقات درست ہے۔ پروفیسر مذکور کی عبارت سے غالباً یہ معنی لیے جاسکتے ہیں کہ اگر حافظ جیسے مشہور شاعر کی شخصی یا خانگی زندگی کے لیے کم و کاست یا خانگی حالات کے بارے میں کما بیش حالات لکھے بھی گئے ہوں تو وہ ایرانیوں نے نہیں لکھے۔ ہندوستانی تذکرہ نویسوں کے متعلق اِن کی رائے کچھ اچھی نہیں رہی ہے۔

حافظؔ سے متعلق کئی داستانیں ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے لکھی ہیں۔ اِن میں ایک رسالہ لطیفہ غینیہ ہے جو شیراز میں ایک بار چھپ بھی چکا ہے۔ پروفیسر محمد معین نے اپنی کتاب حافظؔ شیریں سخن میں رسالہ میں مندرج حافظ سے متعلق بہت سی کہانیوں کی تکذیب کی ہے۔

بہر حال حافظؔ کی گزشتہ زندگی اور گھرانے سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر قیاس اور گمان پر ہی مبنی ہے۔ یہ مفروضات اکثر ایسے اشعار سے اخذ کیے گئے ہیں جن میں جستہ و گریختہ شخصی حالات کے اشارے ملتے ہیں۔ براؤن کے علاوہ شبلی نعمانی نے بھی اسی روش پر عمل کیا اور شاید اس خاص موضوع میں اس کے علاوہ تحقیق کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حافظ کے آبا و اجداد کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کے دو بھائی تھے جو والد کی موت کے بعد پراگندہ ہو گئے۔ دیوان حافظؔ میں ایک قطعہ قزوینی اور حسین پژمان دونوں کے مرتبہ دیوان میں ملتا ہے۔

برادر خواجہ عادل طاب مشواہ ‏ پس از پنجاہ و نہ سال از وفاتش
بسوی روضہ رضوان سفر کرد ‏ خدا راضی ز فعال و صفاتش
خلیل عادلش پیوستہ برخوان ‏ وز آنجا فہم کن تاریخ ساتش

حافظؔ کی اُولاد کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دو فرزند، اُن کی

اختلاف پڑ گیا ہو۔ اب تک ہم نے جو مفروضے قائم کیے ہیں اِن کی بنا پر حافظ کے تین فرزند معلوم پڑتے ہیں یعنی پہلا کمسنی میں ہی چل بسا، دوسرا ۷۷۸ ہجری میں جب حافظ کی عمر اکیاون برس کی تھی اور تیسرا ۷۸۴ میں جب کہ وہ ستاون برس کے تھے۔ اِن میں سے کسی فرزند کی تاریخ تولد معلوم نہیں۔ اس لیے اِن وجوہات پر مندرجہ بالا قول کی تردید مشکل نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ حافظ کے ایک فرزند کا بھی پتہ چلتا ہے۔

''تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ شاہ نعمان نام کا حافظ کا بیٹا تجارت کا شغل کرتا تھا۔ وہ ہندوستان میں فوت ہوا اور برھان پور میں دفن کیا گیا۔ اس عبارت کو غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں نقل کیا ہے اور نعمان کا مدفن اسیر گڑھ بتایا ہے۔ پروفیسر براؤن نے خزانہ عامرہ کے حوالہ ہی سے اس بات کو دھرایا ہے۔ حسین پژمان نے قول مذکور کے سقم وصحت کی ذمہ داری فرشتہ پر ڈالی ہے اور ہاشم رضی نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے۔

شاہ نعمان کے بارے میں کوئی تاریخی اطلاع نہیں ملتی۔ تذکرہ نویسوں نے غالبًا دیوان حافظ میں ایک دو ایسی غزلوں کی بنا پر شاہ نعمان کے ہندوستان جانے کا مفروضہ قبول کیا ہے جن میں غریب الوطنی کا مضمون لطیف اور اثر انگیز انداز سے بیان ہوا ہے

دیارِ غریب کے اشارہ کا ہندوستان کی طرف ہونا اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ اُن دنوں تجار فارس یعنی ایران سے اکثر ہندوستان کی طرف تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ دوسرے کسی ملک کی طرف کمتر جاتے تھے۔ جن دو غزلوں کی طرف ہمارا اشارہ ہے اور جن سے حافظ کے بیٹے کے سفر پر جانے، اور حافظ کی یہ آواز کہ وہ مراجعت کرے وغیرہ قیاس آرائی کی تائید ہوتی ہے درج ذیل ہیں۔

زگریہ مردم چشمم نشستہ در خونست　　ببین کی در طلبت حال مردمان چونست

''وفات خواجہ قطب الدین علی بن خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی ۷۸۴ھ''

مجد زادہ صہبا نے سخنی چند در بار حافظ میں لکھا ہے کہ

میں نے ۱۳۱۴ھ ہجری میں پتھر کو جو مستطیل مکعب شکل میں تراشا ہوا ہے قبرستان دار السلم کے راستے میں پڑا ہوا دیکھا۔ بڑی کوشش کے باوجود اس کے بالائی حصہ پر کندہ شدہ عبارت پڑھی نہ جاسکی۔ البتہ کونوں پر مندرجہ ذیل دو بیت صاف نظر آئے۔

ای سرو ناز گلشن فردوس جای تست
ای روح قدس روضہ رضوان سرای تست

دنیا و مال و جاہ و جوانی گزاشتی
عقبیٰ و روح روضہ رضوان سرای تست

حکمت نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''میں نے بھی اس پتھر کو دیکھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے متعلق اتنا بے فائدہ شور وغل بپا کیا گیا کہ آثار قدیمہ کی چوری کرنے والے اس پتھر کو گران بہا سمجھ کر چرا لے گئے۔''[1]

لیکن چوں کہ سنگ مزار پر کندہ شدہ تاریخ اور قطعہ ''آن میوۂ بہشتی'' سے اخذ ہونے والی تاریخوں کے درمیان چھ سال کا فرق پڑتا ہے اس لیے یا تو یہ فرض کرنا ہوگا کہ حافظ کے دو فرزند ۷۷۸ ہجری میں بالترتیب وفات پا گئے (بشرطیکہ قطعہ زیر نظر فرزند ہی کی وفات پر کہا گیا ہو) یا یہ کہ تاریخوں میں سہواً

---

[1] از سعدی تا جامی ص ۳۸۵

بھی گویا فرضی اور خیالی ہے۔ کیوں کہ اس کی تصدیق کسی بھی اہم اور مستند تذکرے سے نہیں ہوسکی۔

عام لوگوں نے اس شعر کی بنا پر شاخ نبات کو حافظؔ کی معشوقہ خیال کرنے میں تقویت پائی ہے۔

آن ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد
اجر صبر یست کز آن شاخ نباتم دادند

براؤن نے لکھا ہے کہ شاخ نبات نام کی دوشیزہ کے ساتھ حافظؔ کے معاشقہ اور ازدواجی زندگی کے بارے میں جو افسانہ مشہور ہے اس کی تصدیق کسی استوار دلیل سے نہیں ہوتی۔ حسین پژمان نے براؤن کے خیال کی تائید کی ہے البتہ اُس نے ایک دل چسپ نکتہ کی طرف ہماری ترجہ کو مبذول کیا ہے کہ حافظ کی غزل

در ہمہ دیر مغان نیست چو من شیدائی

کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ یہ وہی غزل ہے جو حافظؔ کی گرفتاری کی موجب بنی اور اس سے یوں مستفاد ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ ایک دوشیزہ کی طرف مائل تھے۔ لیکن اُس کے خویشاوندوں نے ایک بے سروسامان شخص کو اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا۔

پژمان کے اس بیان کے بارے میں چند باتیں زیر نظر لانی ہوں گی۔

اول یہ کہ اس نے متذکرہ بالا بیان کو کس تذکرہ یا تاریخ کے حوالہ پر مبنی کیا ہے ہمیں معلوم نہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ محض قیاس آرائی ہے۔

دوم یہ کہ کلمہ ''گرفتاری'' جدید فارسی میں وہ معنی نہیں رکھتا جو ہم قدیم فارسی یا اُردو میں سمجھتے آئے یعنی قید۔ اس کے معنی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہونا ہیں۔

بیا دلعل تو و چشم مست میگونت
زجام غم میٔ لعل کہ میخورم خونست

زمشرق سرکوی آفتاب طلعت تو
اگر طلوع کند طالعم ہمایونست

حکایت لب شرین کلام فرہادداست
شکنج طرہٗ لیلی مقام مجنونست

دلم بجو کہ قدت ہمچو سرد دلجویست
سخن بگو کہ کلامت لطیف موز دنست

زدور بادہ راحتی بجان رسان ساقی
کہ رنج خاطرم از جوردور گردونست

ازان دمی کہ زچشمم برفت رود عزیز
کنارادامن من ہمچو رود جیحونست

چگونہ شاد شود اندرون غمگینم
باختیار کہ از اختیار بیرونست

زبے خودی طلب یار می کند حافظ
چو مفلسی کہ طلب گارگنج قارونست

(۲)

یارب آن آہوی شکین بہ ختن بازرسان
وآن سہی سروخرامان بہ چمن بازرسان

دل آزردہٗ مارا بہ نسیمی بنواز
یعنی آن جان زتن رفتہ بمن بازرسان

ماہ وخورشید بمنزل چو بامرتو رسند
یارمہروی مرانیز بہ من بازرسان

دیدہ ہا درطلب لعل یمانی خوں شد
یارب آن کوکب رخشان بہ یمن بازرسان

سخن انیست کہ مابی تو نخواہیم حیات
بشنوای پیک خبرگیر دسخن بازرسان

آن کہ بودوطنش دیدہٗ حافظ یارب
بمرادش زغریبی بوطن بازرسان

شاخ نبات :۔

حافظ کی اولاد کے متعلق اپنی معلومات قلمبند کرنے کے بعد ہم شاخ نبات کے نام سے مشہور کی گئی حافظ کی معشوقہ کے بارے میں بحث کریں گے۔ یہ افسانہ

۱۔ یہ دونوں غزلیں محمد قزوینی کے مرتبہ دیوان حافظ سے نقل کی گئی ہیں۔ باقی نسخوں میں اختلاف پایا گیا ہے

۲۔ ملاسودی نے شرح سودی بر حافظ میں رود کے معنی بیٹا بتائے ہیں۔ لغت نامہ دہخدا بھی ملاحظہ ہو۔

لے دے ہوئی ہے اس لیے بہتر ہے کہ اسے سہولت مطالعہ کے لیے یہاں نقل کیا جائے۔

در ہمہ دیرِ مغان نیست چو من سودائی — خرقہ جائی گرو بادہ و دفتر جائی

دل کہ آئینہ شاھیت غباری دارد — از خدای می طلبم صحبت روشن رائی

کردہ ام توبہ بدست صنم بادہ فروش — کہ دگر می نخورم بی رُخ بزم آرائی

نرگس ارلاف زد از شیوہ چشم تو مرنج — نروند اہل نظر از پی نابینائی

شرح این قصہ مگر شمع برآرد بزبان — ورنہ پروانہ ندارد بہ سخن پروائی

جویہا بستہ ام از دیدہ بداماں کہ مگو — در کنارم بنشانند سہی بالائی

کشتہ بادہ بیاور کہ مرابی رُخ دوست — گشتہ ہر گوشہ چشم از غم دل دریائی

سخن غیر مگو با من معشوقہ پرست — کزوی و جام میم نیست بکس پروائی

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہہ میگفت — بر در میکدہ با دف دنی ترسائی

گر مسلمانی از نیست کہ حافظ دارد

آہ اگر از پی امروز بود فردائی

بہر حال اگر شاخ نبات نام کی معشوقہ کا افسانہ درست ہو تو کہنا چاہیے حافظؔ اُس کو اپنے نکاح میں لایا ہوگا۔ اور اس رشتہ ازدواج سے از بس خرسند ہو کر اطیمنان کی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ مندرجہ ذیل غزل سے حسین پژمان نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حافظؔ نے یہ غزل اُن قدیم یاران ہم مشرب کی نظر سے گزارنے کے لیے لکھی ہوگی جو اُس کو حسب معمول عیش و طرب کی دعوت دیتے رہے ہوں گے۔

مرا شرطیت با جانان کہ تا جان در بدن دارم

ہوا داری کویش را بجان خویشتن دارم

سوم اگر پژمان کا یہ قول کہ حافظؔ کی معشوقہ کے خویشاوند شادی کے خلاف تھے قابل اعتبار مانا جائے تو یہ ممکن ہے کہ انھوں نے شاہ شجاع کے پاس جاکر حافظؔ کی بدگوئی کی ہو اور غزل مذکور کے ایک شعر کو اُن کی اذیت کے لیے چُنا ہو۔ ایسی صورت صاحبِ عرفات کا لفظ ''معاندین'' کا لانا معنی خیز ہے۔

حسین پژمان کے بیانؔ کی تردید کی کافی گنجائش نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ لکھتا ہے کہ یہی غزل حافظؔ کی گرفتاری کا باعث بنی۔ دوسری طرف کئی تذکروں میں ذکر ہوا ہے کہ اس غزل کے ایک شعر کے جنجالؔ کے بعد ہی حافظ گوشہ نشین ہو کر رحلت کر گئے، اس بیان سے اخذ ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ غزل زندگی کے آخری ایام میں کہی تھی۔ اگر ایسا ہی ہو تو اس کے ساتھ ایک دوشیزہ کا عشق اور اس کے خویشاوندوں کی طرف سے مزاحمت والا افسانہ ملحق کرنا بے معنی سی بات ہے۔ حسین پژمان کا استنباط شاید اس غزل کے تیور سے حاصل ہوا ہے۔ اُس کا قول ماننے میں ہمیں یوں تو کوئی بڑی دقت درپیش نہیں کہ زیرِ نظر غزل میں حافظ نے اپنے مخصوص لطیف اور رمزی انداز میں اپنی مجردانہ زندگی کی بے سروسامانی اور گھرانے کی ترتیب کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ سوچنے میں کوئی تقویت نہیں ملتی کہ حافظؔ کسی دوشیزہ (یا کوئی دوشیزہ جس کا نام شاخ نبات ہو) کے عشق میں مبتلا تھے۔ علاوہ ازین یہی وہ غزل ہے جس پر مشہور عالم جلال الدین دوانی نے عرفانی مطالب پر مبنی شرح لکھی تھی۔ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین کی مجلس ہفتم میں علامہ دوانی کی شرح کا حوالہ دیا ہے، اور آخر کار یہ شرح تہران کے ادبی رسالہ ارمغان کے ۱۳۲۰ ہجری شمسی کی اشاعت میں چھپ گئی۔ جلال الدین حافظ کے زمانے سے بہت دور نہیں تھا۔ اس لیے اس کی لکھی ہوئی شرح بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس لحاظ سے حسین پژمان کا عقیدہ اس غزل میں ایجاد کا نون خانوادگی کی خواہش پائی جاتی ہے رد ہوتا ہے۔ چوں کہ اس غزل پر کافی

چوتھا باب

عصرِ حافظ

ازروے قیاس یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حافظؔ کی رفیقہ حیات اس سے پہلے ہی رحلت کر چکی تھی اور یہ صدمہ اس کے لیے جانکاہ تھا۔ مندرجہ ذیل غزل سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔

آن یار کز و خانہ ما جای پری بود
سرتا قدمش چوں پری از غیب بری بود

دیوان حافظؔ میں ہماری نظر سے ایسا کوئی قطعہ نہیں گزرا ہے جس میں حافظؔ نے صراحت سے اپنی اہلیہ کا ذکر کیا ہو یا اس کی رحلت پر مادہ تاریخ کہا ہو، جیسے کئی دیگر لوگوں کے لیے کہے جا چکے ہیں۔ اِن کی شخصی زندگی کے مختصر سے حالات جو سطور بالا میں بیان ہوئے فی الجملہ ظن اور قیاس پر ہی مبنی ہیں۔ اِن کی درستی کی تصدیق ایک مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔

اور اگر یہ مانا جائے کہ حافظ ۷۱۷ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ تو امیر پیر حسن کے قتل کے وقت اِن کی عمر چھبیس برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اِن سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے اور مندرجہ ذیل غزل میں اپنے تاثرات کا اظہار ضرور اس طرح کیا ہے۔

روز ہجران وشب فرقت یار آخر شد — زدم این فال وگزشت اختر وکار آخر شد

آن ہمہ ناز وتنعم کہ خزان می فرمود — عاقبت در قدم باد بہار آخر شد

شکر ایزد کہ بہ اقبال کلہ گوشہ گل — نخوت باددی وشوکت خار آخر شد

صبح اُمید کہ بُد معتکف پردۂ غیب — گو برون ای کہ کار شب تار آخر شد

آن پریشانی شب ہای دراز غمِ دل — ہمہ در سایہ گیسوی نگار آخر شد

بادرم نیست زبد عہدی ایام ہنوز — قصہ غصہ کہ در دولت یارا خر شد

ساقیا لطف نمودی قدحت پرمی باد — کہ بتدبیر تو تشویش خمار آخر شد

در شمار ار چہ نیاورد کسی حافظ را

شکر کان محنت بی حد وشمار آخر شد

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے امیر پیر حسن کے دور کی تباہی اس کے ظلم وستم اور شاہ ابو اسحاق کے دورِ حکومت کے آغاز کو صحیح مان لیں تو کئی اشارات سے اس ظن کو تقویت پہنچتی ہے۔ بطور مثال ناز وتنعم، خزان، نخوت باددی۔ شوکت خار، شب تار، تشویش خمار، محنت بے حدود وشمار وغیرہ ترکیبیں علامتی ہیں۔ اور پیر حسن چوپان کی سفاکی اور اس کے ظلم وستم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے برعکس باد بہار، اقبال کلہ، گوشہ، گل نگار، صبح اُمید، گیسوی نگار، قدحی پُرمی وغیرہ خوش بین اصطلاحیں، شاہ شیخ ابو اسحاق کی انصاف پروری اور رعیت دوستی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ غزل حافظ کی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی دور کی ہو، کیوں کہ اول تاریخ کے لحاظ سے سطور بالا میں ایک دلیل پیش کی گئی ہے دوسرے یہ کہ اس مقطع

خواجہ حافظؔ کے زمانے کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ ہر حساس شاعر کی طرح اپنے وقت کے سیاسی حالات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ وہ اپنے تاثر کا اظہار رمز و کنایہ میں کرتے رہے ہیں۔ جدید ایرانی محققوں نے حافظؔ کی غزلوں کی ایک خاصی تعداد کو اُس وقت شیراز اور اس کے آس پاس رونما شدہ سیاسی حالات کے پس منظر کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی غزلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض اوقات کس طرح کا نتیجہ نکالنے والوں کی رائے میں مبالغہ کا شک ہوتا ہے، لیکن جو شخص اُس وقت کی سیاسی اور سماجی تاریخ سے بخوبی واقف ہے اور ساتھ ہی حافظؔ کی روش کو بھی اچھی طرح جانتا ہے وہ اُن کے لطیف اور غیر محسوس اشاروں کو بڑی زحمت کے بغیر سمجھ سکتا ہے۔ اُنھوں نے بسا اوقات شاہان وقت کو کنایہ میں محبوب اور دوست جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو رقیب و حریف وغیرہ سے۔ اسی پردہ میں اُنھوں نے سلطان وقت کے تئیں اپنی ارادت اور اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور اُس کے دُشمنوں کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کی نکوہش کی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم صرف ایک مثال سے کریں گے۔ اگرچہ اگلی سطور میں مناسب مقام پر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالنے کا امکان ہے۔

حافظؔ کی ایک غزل کو شیراز کے چوپانی خاندان کے حکمران امیر پیر حسن کے زوال اور اس کے ذریعے ڈھائے گئے مظالم سے نجات اور شاہ ابو اسحاق اینجو کے برسر حکومت آنے سے متعلق خیال کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۷۴۳ ہجری میں رونما ہوا۔

یوں ہو:

۱۔آل مظفر۔فارس،عراق عجم اور کرمان،

۲۔آل جلایر۔بغداد اور آذربائیجان میں۔

۳۔اال سربدار۔سبزوار میں۔

۴۔ملوک کُرت۔ہرات اور شمال مشرق ایران میں۔

البتہ مظفریوں کے ساتھ ابو اسحاق اینجو کا نام بھی آتا ہے۔چوں کہ مظفری خاندان کے بانی سلطان مبارز الدین اور شاہ شیخ ابو اسحاق کی تاریخ ایک دوسری سے مرتبط ہے۔اس لیے لازمی طور پر اس کا ذکر مناسب مقام پر اور متعلقہ واقعات کے دوران کیا جائے گا۔فی الحال اُس کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ ۷۴۴ ہجری میں چوپانی خاندان کے آخری بادشاہ شیخ ابو اسحاق کے ہاتھوں نیست نابود ہوا اور ابو اسحاق نے شیراز میں مستقر ہو کر اپنے آپ کو رسمی طور پر فارس کا بادشاہ کہلوایا۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی زندگی کے اخری دن تک چلنے والی کشمکش میں مبتلا ہوا اور آخر کار مظفریوں کے پہلے سلطان امیر مبازالدین کے ہاتھوں اُس کا اور اس کے خاندان کا خاتمہ ہوا۔

جس دور کا ذکر ہم نے شروع کیا ہے وہ ایران اور فارس کی تاریخ کے خوفناک ترین ادوار میں شامل ہے۔اس دور میں شیراز،بل کہ فارس پے در پے کشت وخون کے حادثوں میں پڑتا اور اُن سے باہر نکلتا رہا۔ایک طرف تیموری آشوب کا ہنگامہ بپا تھا اور دوسری طرف مظفریوں نے سفاکی اور ظلم و جبر کا بازار گرم رکھا تھا۔کئی عظیم خاندان اور شخصیتیں نیستی اور نابودی کے گرداب میں پڑ گئیں اور شیراز کے خوش گزران لوگوں کے عیش و آرام میں عظیم خلل پڑا۔ایسے ہی حالات کے پیش نظر ہم اگلے صفحات میں حافظ کی بعض غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔

مظفری خاندان کی طرف توجہ دینے سے پہلے ایک اور اہم پہلو کو زیر غور

میں شاعر نے انکشاف کیا ہے کہ مجھے کوئی خاطر میں نہیں لاتا اور سیاسی ماحول سے جلدی اور شدت سے متاثر ہوتا ہے بل کہ اپنا ردِّ عمل بھی ظاہر کرتا ہے۔

سیاسی حالات کی طرف محتاط اشارات کو حافظ کی غزلوں کا اہم عنصر خیال کرنا چاہیے اور اِن کی اِن تما غزلوں کو جن میں تاریخ اور سیاسی واقعات کا خفیف یا واضح اشارہ ہو سنجیدگی سے اور افراط وتفریط کے بغیر زیرِ غور لانا چاہیے۔ چوں کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نہ حافظ کا پورا اور عمیق مطالعہ کیا جائے اور ہر زیر نظر غزل کو فرداً فرداً سامنے نہ لایا جائے۔ اس لیے ہم نے عصرِ حافظ کے عنوان سے زیرِ تحریر باب کا اضافہ ضروری سمجھا ہے تا کہ اُن حالات کی روشنی میں حافظ کی شخصیت نمایاں طور پر ہمارے سامنے آئے جو ان کے شعور اور لاشعور میں جاگزیں ہو چکے تھے، اگر چہ گزشتہ اوراق میں ہم نے جستہ و گریختہ چند تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن اِن سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

حافظ کی زندگی کا زمانہ ساٹھ اور ستر برس کے درمیان کا ہے یعنی غالباً ۷۲۷ ہجری سے لے کر ۷۹۲ ہجری تک۔ لیکن سہولت کار کے لیے ہم پوری آٹھویں صدی ہجری کے تاریخی واقعات کا اجمالی طور پر جائزہ لیں گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس صدی کی ابتدائی اور آخری حدود سے کسی قدر تجاوز کریں اور کچھ غیر متعلقہ واقعات کو درج کریں۔ مدعا صرف اس قدر ہے کہ جس زمانے کو ہم زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ اور جن واقعات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں اِن پر مکمل روشنی پڑے تا کہ پس و پیش اور شک تردید کو حتیٰ الامکان کم کر دیا جائے۔

تیمور کی ولادت اور چنگیزی خاندان کے آخری بادشاہ سلطان ابوسعید کی موت ایک ہی سال یعنی ۷۳۶ ہجری میں واقع ہوئی اس کے لگ بھگ پچاس سال بعد یعنی ۷۸۶ تک بل کہ آٹھویں صدی کے اختتام تک ایران میں پانچ مقابلتاً چھوٹے چھوٹے خاندان ملک کی مختلف نواحی میں سر اقتدار رہے۔ اِن کی فہرست

ہوں گئے۔

ا۔ آل مظفر اور آل اینجو

۷۰۸ھ ہجری میں یزد کے حکمران خاندان اتابکان یزد کا زوال ہوا اور منگولوں کے آخری بادشاہ ابوسعید کی طرف سے وہاں کی حکومت کی باگ ڈور مظفری خاندان کے بانی امیر مبارز الدین محمد کو سونپی گئی۔ یہ خاندان ۷۹۵ھ ہجری تک برسر اقتدار رہا اور اسی سال نہ صرف اس کا آخری بادشاہ شاہ منصور امیر تیمور کے ہاتھوں قتل ہوا بلکہ اس خاندان کے تقریباً تمام شہزادے قتل کر دیے گئے۔ فارس، کرمان، یزد اور عراق امیر تیمور کی سلطنت میں شامل ہوئے اور مظفری خاندان نے تقریباً ستر برس تک حکومت کی جو حافظؔ کے پورے دورِ حیات پر محیط ہے۔

مظفری خاندان خواف کے ایک شخص بنام امیر غیاث الدین حاجی کی نسل سے متعلق ہے۔ جامع التواریخ حسینی میں درج ہے کہ امیر غیاث الدین حاجی خراسان میں سجاوند کے قصبہ کا رہنے والا تھا۔ وہ اچھے اخلاق کا مالک تھا اور اس قدر قومی ہیکل اور بلند قامت تھا کہ جو موزہ اس کے پاؤں میں ٹھیک آئے وہ حسب دستور بنوانا پڑتا تھا اور اس کی شمشیر یزدی وزن میں ساڑھے تین من کی تھی۔ امیر غیاث الدین کے اجداد ایران پر عربوں کی لشکر کشی کے دوران عربستان سے آکر خراسان میں بس گئے تھے اور منگولوں کے حملہ خراسان کے وقت بخصوص چنگیزی فتنہ میں خواف (خراسان) سے فرار کر کے یزد میں آئے تھے۔ اُس وقت یزد کی حکومت اصفہان کے حاکم ابوجعفر علاالدولہ کاکویہ دیلمی کی اولاد کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ وہی علاالدولہ ہے جس کے دربار میں شیخ الرئیس ابن سینا نے اپنی زندگی کے آخری دن کاٹے تھے۔ اور اپنی ایک مشہور کتاب ''دانشنامہ علائی'' کو اُسی کے لیے فارسی میں لکھا تھا۔ علاالدولہ کے حکمران خاندان کو اتابکان یزد کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

لانا ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہرج دمرج اور سیاسی افراتفری کے دور میں ہی ایران میں فارسی شاعری نے زیادہ رواج پایا اور زیادہ ترقی کی۔ بطور مثال اِن ہی پچاس برسوں کی مدت کو لیجیے۔ اس قلیل عرصہ میں ایران میں کئی صف اولین کے شاعر نمودار ہوئے جن میں اس ملک کا عظیم اور لافانی شاعر حافظ سرفہرست ہے۔ اس کے مقابلہ میں صفوی دور جو لگ بھگ ۲۳۵ برس تک برقرار رہا اور جس کے دوران ایران اپنی استحکامت، قوت اور شوکت میں بے نظیر ہوا بمشکل دو یا تین قابلِ ذکر شاعر پیدا کر سکا۔ جن کی شہرت اتنی نہیں جتنی دور ماقبل کے شاعروں کی ہے۔ البتہ صنایع مستظرفہ کی ترویج و ترقی کے لیے صفوی دور اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں تک افراتفری اور بے سروسامانی کے زمانے میں شاعری اور ادب کی ترقی کا تعلق ہے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایران میں شعر و شاعری کی ترویج اور شاعروں کی سرپرستی اکثر حالات میں سلاطین، امرا اور وزرا کے دربار سے مربوط تھی۔ چوں کہ طوائف الملوکی کے زمانے میں ایک سلطان یا امیر دوسرے پر سقبت حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ دوسروں سے بڑھ کر شعرا کی حوصلہ افزائی کرتا۔ بل کہ بعض اوقات کسی مشہور شاعر کو لالچ دے کر ایک سلطان کے دربار سے الگ کر کے خواہشمند سلطان کے دربار میں بلایا جاتا۔ اگرچہ حافظ آزاد فکر اور بے حرص آدمی تھا تاہم اِن کے یزد کے سفر کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہاں کے شاہ سے زیادہ مالی سہولت کی اُمید رہی ہو۔ علاوہ ازیں کئی غزلوں سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ تبریز، اصفہان اور بغداد کو جانے کی خواہش بھی رکھتا تھا۔ اس خواہش کی نمود دراصل وہاں کے سلاطین سے عنایات اور تفقدات کی اُمید وابستہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شاید اِن کے ذاتی حالات خواہش کو پورا کرنے کے مساعد نہ تھے لہٰذا ان سفروں کے ارادوں سے منحرف ہوئے۔ اگر ہندوستان کے مبینہ سفر کی داستان کو صحیح مانا جائے تو ایک بار پھر یہی کہنا ہوگا بہمنی یا بنگالہ کے سلطان سے نوازشات کی توقع رکھتے

کے بطن سے ۷۰۰ ہجری میں امیر مبارز الدین محمد مظفر متولد ہوا۔
۷۰۷ ہجری میں وہ کرمان سے شیراز آیا اور یہ کمسن لڑکا یعنی مبارز الدین اس کے ساتھ تھا۔ امیر مظفر نے الجایتو سے ملاقات کی غرض سے خانقین کا سفر کیا اور اُس وقت بھی کم سن مبارز الدین اُس کے ہمراہ تھا۔ امیر مظفر ۷۱۳ ہجری میں شبانکارہ میں فوت ہوا۔ اور میبد کے اس مدرسہ میں دفن کیا گیا جو اُس نے خود بنایا تھا اور جس کا نام مدرسہ مظفریہ رکھا گیا تھا۔ اس کا یہی کمسن لڑکا امیر مبارز الدین محمد مظفری خاندان کا بانی ہوا جس نے تقریباً ستر برس تک شیراز اور اس کے گردونواح پر حکومت کی۔

۲۔ امیر مبارز الدین محمد مظفر:۔

اُلجایتو نے مبارز الدین محمد کو اُس کے باپ کے بعد یساولی (جلوداری) کا منصب دیا۔ اُلجایتو کے بیٹے ابوسعید نے مبارز الدین کو تفویض کیے گئے منصب پر بدستور برقرار رکھا۔ ۷۱۷ ہجری میں اُسے مَیبُد بھیجا گیا۔ جیاں وہ شاہراہوں کی حفاظت اور وہاں کی حکومت کی نگرانی کرتا رہا۔ اِن ہی دنوں فارس کے شحنہ سید عضد الدین یزدی کے جو مشہور شاعر جلال الدین یزدی کا باپ تھا اور ایلخانیوں کے درمیان روابط بگڑ گئے لیکن امیر مبارز الدین نے حسن نیت اور معاملہ فہمی سے کام لے کر اس قضیہ کو بغیر کسی زیاں کاری کے سُلجھا دیا اور اس طرح ایلخانی حکمران ابوسعید کی نظروں میں اور بھی قابلِ اعتماد بن گیا۔
۷۱۸ ہجری میں اتابکان یزد کے آخری فرمانروا اتابک حاجی شاہ اور امیر غیاث الدین کیخر وانجو (شاہ شیخ ابو اسحاق کا بھائی) کے نائب کے درمیان شرمناک بات پر جھگڑا ہوا۔ امیر کیخسرو کا نائب جھگڑے میں مارا گیا۔ جب یہ خبر اُسے ملی، اُس وقت وہ میبد میں امیر مبارز الدین کے پاس تھا جس سے وہ اس کے پاس موجود ایک بے نظیر گھوڑے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ امیر کیخسرو پر بگڑ گیا اور

امیر غیاث الدین حاجی کے تین بیٹے تھے جن میں سے دو شاہ علا الدین اتا بک یزد کی خدمت میں شامل ہوئے۔ اتا بک علا الدین کی وفات یعنی ۶۶۲ ہجری سے لے کر ۶۹۰ ہجری تک اس کا بیٹا اتا بک یوسف شاہ یزد کا حکمران رہا اور اُس نے میبد اور ندوشن کی حکومت امیر غیاث الدین کے پوتے شرف الدین مظفر کو سونپ دی۔ کئی تذکروں اور بخصوص محمود گیتی نے تاریخ آل مظفر میں شرف الدین مظفر کے ایک عجیب خواب کی داستان بتائی ہے اس نے خواب میں دیکھا کہ۔

"اتا بک علاء الدین کے گھر سے سورج نکلتا ہے اور اُس کے اپنے گریبان میں جا پڑتا ہے۔ جب وہ اُٹھتا ہے تو آفتاب کے چند ٹکڑے اس کے دامن سے گر جاتے ہیں۔"

اس خواب کی تعبیر ایک بزرگ سے پوچھی گئی۔ اس نے کہا کہ بشارت ہو کہ اتا بکوں کے خاندان سے سرداری نکل کر تمہارے خاندان میں آئے گی۔ حبیب السیر میں تعبیر گو کا نام شیخ دادا بتایا گیا ہے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ ہو سکا یہ کون شخص ہے۔

رفتہ رفتہ امیر شرف الدین مظفر نے اپنی سرداری کی حدود میں بڑا اقتدار حاصل کیا۔ جب اتا بک یوسف شاہ نے ایلخانیوں سے سرپیچی کی تو غازان کی فوجیں امیر محمد ابداجی کی سرگردگی میں یزد پر حملہ آور ہوئیں۔ مقاومت کی تاب نہ لا کر یوسف شاہ نے سیتان کی طرف فرار کیا۔ امیر مظفر کچھ دیر کے لیے بطور ملازم اس کا ہمرکاب رہا اور پھر الگ ہو کر کرمان میں سلطان جلال الدین سیور غتمش قراختائی کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑی مدت کے بعد پھر کرمان آیا اور بلآ خرارغون خان اور پھر کیخاتو کے حکم سے کرمان میں کسی اہم منصب کا پر فائیز ہوا۔ ساتویں صدی کے اواخر میں امیر مظفر نے ہزارہ کے ایک امیر کی بیٹی سے شادی کی اور اُس

آسمان میں بلند کرتے ہوئے بادشاہ کے سامنے سے گزرا، اور سر کے پیچھے پھینک دیا۔ لوگوں نے شاباشی دی، محمد مظفر پیادہ ہوکر بادشاہ کے سامنے زمین بوس ہوا اور عرض کی کہ بادشاہ توبرہ کھولنے کا حکم دے۔ توبرہ کھولا گیا تو اُس کے اندر سے ساٹھ من یزدی وزن کے لوہے کا ٹکڑا نیچے گرا۔ سلطان نے آفریں کہی اور خلعت اور منصب عطا کیے۔ اس طرح محمد مظفر میبد اور اُس کے ملحقات کا آزاد حکمران مقرر ہوا جس کی رکاب میں دوسو آدمی حاضر رہا کرتے تھے۔

یزد میں اپنی موقعیت مضبوط کرنے کے بعد مبارز الدین نے اپنی فرمانروائی میں ڈاکوں اور چوروں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ ۷۲۹ ہجری میں اُس نے شیراز میں قراختائی سلطان قطب الدین کی بیٹی خان قتلغ مخدوم شاہ کو حبالۂ عقد میں لایا۔ جس کے بطن سے تین لڑکے شاہ شجاع، شاہ محمود اور شاہ احمد متولد ہوئے۔ ماں کی طرف شاہ شجاع قراختایوں کا خون حاصل کر چکا تھا۔ ایلخانی سلطان ابوسعید سے امیر زادہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد مظفر نے یزد میں آباد کاری اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف توجہ دی اور کئی عالیشان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ کئی گاؤں اور قصبے آباد کیے جواب تک اسی خاندان سے منسوب ہیں۔ مثلاً مبارز آباد، ترک آباد، شاہ آباد، مظفر آباد، علی آباد اور محمود آباد۔

۷۳۶ ہجری میں ایلخان کا آخری حکمران ابوسعید فوت ہوا اور اس کے ساتھ اس خاندان کی طویل حکومت کا دور ختم ہوا۔ کیوں کہ اُس کے جانشینوں میں کسی میں اس وسیع مملکت کو سنبھالنے کی لیاقت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایران میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو امیر مبارز الدین نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اپنی خود مختاری کا علم بلند کیا۔ اس وقت فارس کا علاقہ شاہ شرف الدین محمد اینجو کی اُولاد کے ہاتھوں میں تھا اور وہ یزد اور کرمان پر حریصانہ نگاہیں ڈال رہے تھے۔ شرف الدین محمد کے چھوٹے بیٹے ابواسحاق اینجو نے جب کرمان کی طرف عنان

ایلخان کے پاس شکایت کی۔ چناں چہ ایلخان نے امیر مبارز الدین محمد کو اتابک حاجی شاہ کی تنبیہ کے لیے بھیجا۔ یزد کی گلیوں میں دو طرف سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوئی جس کے نتیجہ میں اتابک حاجی شاہ کو بھاگنا پڑا۔ اور اس کے ساتھ اتانکان یزد کا بھی خاتمہ ہوا۔ سال ۷۱۸ ہجری کو امیر مبارز الدین کی حکومت کا پہلا سال خیال کرنا چاہیے کیوں کہ اتابک حاجی شاہ کی شکست کے فوراً بعد مبارز الدین ابوسعید کی خدمت میں پہنچا اور اپنے لیے اتابکان یزد کی جانشینی کا حکم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مبارز الدین مظفر کی ابوسعید ایلخانی سے ملاقات کو تاریخ جدید یزد میں بڑی دل چسپ کہانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ محمد مظفر اٹھارہ برس کا جوان تھا، اُس نے اُردو (منگول فوج) کی ملازمت اختیار کی، اور سلطان ابوسعید اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ چناں چہ اس کو تمام امراء کے اوپر نشست ملی۔ ابو مسلم نام کا ایک شخص پایہ تخت میں مشہور پہلوان تھا، سلطان ابوسعید کے محمد مظفر کی نسبت قدر ومنزلت .... کو دیکھکر وہ حسد سے جلنے لگا، اُس نے محمد مظفر کو آزردہ یا شرمندہ کرنے کی غرض سے اپنی کمان اُسے دی کہ کھینچو۔ محمد مظفر نے اس کمان کو اپنی کمان کے ساتھ جوڑا اور پھر دونوں کو باہم کھینچ لیا۔ پھر الگ کر کے صرف اپنی کمان ابو مسلم پہلوان کو دی کہ کھینچو۔ لیکن بڑی کوشش کے باوجود اسے نہ کھینچ سکا۔ شرمندہ ہو کر چلایا کہ کل میدان میں نیزہ بازی میں مہارت کا مظاہرہ کیا جائے۔ کمان اُٹھانا تو سہل ہے۔

اگلے روز سلطان اور دیگر امرا اور تماشا بین میدان میں آئے۔ گھاس کا توبرہ میدان میں پھیکا گیا تھا۔ محمد مظفر نے نیزہ ہاتھ میں لیا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ نیزے کو گھاس کے توبرہ پر اس زور سے مارا کہ اس کی نوک ٹوٹ گئی۔ سخت غضب ناک ہوا اور نیزہ کی شکستہ نوک کو ایک بار پھر توبرہ پر دے مارا اور اس کو

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین

کہ قاضیی بہ آزاد آسمان ندار یاد

اسی قاضی مجد الدین کی وفات پر حافظ نے یہ قطعہ کہا ہے۔

مجد دین سرور دسلطان قضات اسمعیل کہ زدی کلک زبان آورش از شرع نطق

ناف ہفتہ بد داز ماہ رجب کاف والف کہ بیرون رفت ازین خانۂ بی نظم و نسق

کنف رحمت حق منزل او دان و آنگہ

سال تاریخ وفاتش طلب از رحمت حق

قاضی مجد الدین کو شیراز کے قاضیوں کے مشہور خاندان کا چشم و چراغ بتا یا گیا ہے۔ صاحب شیراز نامہ لکھتا ہے کہ:۔

"شیراز کے امور شرع اور قضا کا منصب ڈیڑھ سو سال تک اسی کا خاندان کے سپرد رہا۔ قاضی مجد الدین کو اپنے زمانے کا نہایت خوش قسمت انسان خیال کرنا چاہیے کیوں کہ اُس نے ایکطرف شیخ سعدی کے ایام کو بھی دیکھا اور دوسری طرف حافظ کی زندگی کے کچھ ابتدائی حصہ کو بھی۔"

شیخ سعدی نے اس کے والد قاضی رکن الدین کی مدح میں قصیدہ بھی کہا ہے۔ اور شیخ سعدی کی وفات کے وقت قاضی مجد الدین کی عمر تیس برس کی تھی۔ کوئی تعجب نہیں کہ حافظ نے اسی قاضی مجد الدین کی زبان سے شیخ سعدی کے متعلق کچھ باتیں سُنی ہوں۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ۷۲۷ ہجری میں میرے شیراز جانے کا مقصد "الشیخ القاضی الایام، قطب الاولیا، فرید الدھر ذی الکرامات الظاہر مجد الدین اسمعیل بن محمد بن خدا داد کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا تھا۔ ابن بطوطہ نے مدرسہ مجدیہ، محضر قضادت اور

عزیمت موڑی تو محمد مظفر نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ لیکن وہ تھوڑی ہی مدت میں ابو اسحاق کے مخاصمانہ ارادوں سے باخبر ہوا۔ بہر حال شیخ الاسلام شہاب الدین علی کے بیچ بچاؤ سے اِن کے درمیان کدورت رفع ہوئی اور ابو اسحاق واپس شیراز چلا گیا۔

ہم بتا چکے ہیں ۷۴۰ہجری میں امیر چوپانی فارس میں داخل ہوا۔ امیر مبارز الدین کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اور قدیم عہد و پیمان پر کاربند رہتے ہوئے وہ جلال الدین مسعود شاہ اینجو کے خلاف ہو کر استخر میں پیر حسن سے جاملا۔ جلال الدین نے کازرون کی طرف رُخ کیا لیکن مبارز الدین نے اس کا تعاقب کرنا نہ چھوڑا۔ بہر حال شاہ اینجو بھاگ کر بغداد کی طرف نکل گیا۔ امیر مبارز الدین نے شیراز کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شہریوں نے بڑی مقاومت کی۔ جب حالات اُن کے لیے ازبس نامساعد ہوئے تو قاضی مجد الدین نے جو اس زمانے کا بہت بڑا عالم زاہد اور دیندار آدمی تھا یہ شعر لکھ کر امیر مبارز الدین کے پاس بھجوا دیا۔

مبارزان جہان قلب دشمنان شکنند
تراچہ شد کہ ہمہ قلب دوستان شکنی

آخر کار صلح ہوئی اور پیر حسن چوپانی امیر مبارز الدین کی مدد سے فاتحانہ انداز میں شیراز میں داخل ہوا اور کرمان کی حکومت مبارز الدین کو سونپ دی۔

قاضی مجد الدین کا نام سطور بالا میں لیا گیا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس کا حافظ نے نیکی سے یاد کرتے ہوئے اِن پانچ بزرگ شیرازیوں میں شامل کیا ہے۔ جنھوں نے عوام کی فلاح و رفاہ کے عوض نیک نامی حاصل کی تھی۔

قطعہ کا متعلقہ شعر یہ ہے۔

ملاحظہ کی جائیں تو معلوم ہوگا کہ پہلی غزل کے تیور قصیدہ کے سے ہیں نہ کہ غزل کے۔

از بخت شکر دارم داز روزگار ہم دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم

....

یارب چہ درخور آمدش گردش خط ہلالی یا مبسماً یحا کی درجاً من الالی

امیر مبارز الدین کے دورِ حکومت کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس کو قبائل کے ساتھ اکثر جنگ و جدل میں مشغول پایا جاتا ہے۔ یہ قبائل ہزارہ۔اوغانی اور جرمائی نام کے ہیں، جن کو ارغون خان کی حکومت کے دوران سلطان سیور غتمش کی التماس پر کرمان کے اطراف کی حفاظت کے لیے وہاں آباد کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اِن کی تعداد اور قوت میں کافی اضافہ ہوا۔ اور باوجودیکہ امیر مبارز الدین کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے اُس کے خلاف بغاوت اور جنگ و جدل میں لگے رہے۔ یہ قبائل منگولوں کے طائفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے قبیلوں میں اضام رکھتے اور ان کی تعظیم کرتے۔ اسی لیے علمائے اسلام نے اِن کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا۔

امیر مبارز الدین اِن کے ساتھ جنگ و جدل کو جہاد سمجھتا تھا اور اسی مناسبت سے اُسے ''امیر غازی'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ حافظ نے بھی اسی سلطان کو ''شاہ غازی'' کے لقب سے یاد کیا جب آس کی آنکھیں نکالی گئیں:

شاہ غازی خسرو گیتی ستان آنکہ از شمشیر او خون می چکید

اور خواجوی کرمانی نے بھی ایک قصیدہ میں خسرو غازی کہا ہے۔

خسرو غازی محمد حامی ملک عجم سام کیخسرو حشم دارای افریدون حشم

شاہ شیخ ابو اسحاق اور امیر مبارز الدین کے درمیان بار ہا ٹڈ بھیڑ ہوتی رہی۔ مورخوں نے شاہ شیخ ابو اسحاق پر بار بار دوستی اور عہد و پیمان توڑنے کی تہمت لگائی ہے۔ چناں چہ اُن کے قول کے مطابق وہ سات بار نقض پیمان کا مرتکب ہو کر کرمان اور یزد پر چڑھائی کرتا رہا۔ بار ہا اوغانی اور جرمائی قبایل کو اپنے ساتھ ملاتا

قاضی مجد الدین کے تئیں شہر کے لوگوں کے احترام وغیرہ جیسی باتوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ اس نے ۷۴۸ ہجری میں شیراز کا دوسرا سفر کیا جب کہ وہ ہندوستان سے جزیرہ ہرمز کی راہ سے واپس وطن جارہا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ لکھتا ہے کہ ایک دن شیخ ابواسحاق اینجو کو یں نے قاضی مجد الدین کی مجلس میں نہایت ادب اور احترام سے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ بزرگ کے سامنے کان پکڑ کر بیٹھا منگولوں اور ترکوں کے مراسم میں ادب اور احترام کی علامت ہے۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ مدرسہ مجدیہ میں گیا تو دیکھا دروازہ بند ہے۔ سبب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شاہ شیخ ابواسحٰق کی والدہ تاش خاتون اوراس کی بہن ملک خاتون کے درمیان میراث کے متعلق اختلاف پیدا ہوا ہے۔ سلطان نے اِن دونوں کو محاکمہ کی غرض سے قاضی مجد الدین کے پاس لایا اوراس نے شرع کے اصول کے مطابق فیصلہ دیا۔ ۷۴۲ھ ہجری میں امیر مبارز الدین نے اپنے وقت کے ایک باوقار دانشمند شخص خواجہ برہان الدین کو وزارت عظمیٰ سونپ دی۔ یہ برہان الدین ابونصر فتح اللہ خواجہ کمال الدین ابوالمعانی کا بیٹا تھا اوراس کا نسب نامہ خلیفہ سوم عثمان بن عفان سے جاملتا ہے۔ اس شخص نے دس سال تک یزد میں وزیراعظم کے فرائض انجام دیے۔ ۷۵۲ ہجری میں استعفیٰ دینے کے بعد ۷۵۶ھ ہجری میں دوبارہ اسی جلیل عہدے پر مامور ہوا۔ اور چوں کہ اسی سال قاضی مجد الدین اسمعیل کی وفات ہوئی اس لیے قاضی القضاۃ کا عہدہ وزارت عظمیٰ میں ضم کیا گیا۔ جس کی صدارت وہی کرتا رہا۔ لہٰذا اس کی اقامت گاہ شیراز ہی تھا۔ برہان الدین ۷۶۰ھ ہجری میں فوت ہوا۔

برہان الدین انصاف پروری اور داد و دہش کے لیے مشہور تھا۔ اس کی تعریف میں دیوان حافظ میں دو غزلیں ملتی ہیں جو غالباً ۷۵۶ اور ۷۶۰ھ ہجری کے درمیان کہی گئی تھیں۔ یہ دو غزلیں علامہ قزوینی کے مرتبہ دیوان حافظ کے مطابق

سکندری کہ مقیم حریم او چون خضر — زفیض خاک درش عمر جاودان گیرد

جمال چہرہ اسلام شیخ ابو اسحاق — کہ ملک درقدمش زیب بوستان گیرد

چراغ دیدہ محمود[2] آنکہ دشمن را — ز برق تیغ دی آتش بدودمان گیرد

باوج ماہ رسد موج خون چو تیغ کشد — بہ تیر چرخ بر دحملہ چون کمان گیرد

عروس خاوری از مشرم را کی انواو (کذا) — بجای خود بودار راہ قیردان گیرد

ابا عظیم وقاری کہ ہر کہ بندہ تست — ز رفع قدر کمر بند تو امان گیرد[3]

مدام در پی طعن است بر حسود و عدوت — سماک رامح ازان روز و شب سنان گیرد

فلک چو جلوہ کنان بنگرد سمند ترا — کمینہ پایہ گہش اوج کہکشان گیرد

ملامتی کہ کشیدی سعادتی دہدت — کہ مشتری نسق کار خود ازان گیرد

ازامتحان تو ایام را غرض آنست — کہ از صفای ریاضت دلت نشان گیرد

وگرنہ پائیہ عزت ازان بلند ترست — کہ روزگار براد حرف امتحان گیرد

---

[1] ملا سودی کی شرح میں یہ بیت دیکھی نہیں گئی۔ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر "روضہ کرم ہی ہے
تو یہ کسی باغ کا نام ہے لیکن اگر "کرم" کے لغوی معنی لیے جائیں تو روضہ کرم بہ معنی روضہ جوانمردی کچھ نہیں دیتا۔
قزوینی کا خیال ہے کہ "کرم" دراصل لفظ" "ارم" کی تصحیف سے ہوا ہے۔ پس روضہ ارم کی ترتیب زیادہ قرین
قیاس ہے گمان ہے کہ شیراز میں شاہ شیخ ابو اسحاق کے بنوائے گئے باغ کا نام روضہ ارم تھا یا کسی اور
جگہ اس نام کا باغ تھا۔ حافظ کی ایک غزل میں "گلستان ارم کی ترتیب آئی ہے۔

درگلستان ارم دوش چو از لطف ہوا — زلف سنبل بہ نسیم سحری می آشفت

گفتم ای مسند جم جام جہان بینت — گفت افسوس کہ آن دولت بیدار بخفت

(باقی حاشیے صفحہ ۱۷۱ پر)

[2] یعنی شرف الدین محمود شاہ اینجو۔ جمال الدین ابو اسحاق کا باپ

[3] توامان سے مراد بُرج جوزا نہیں۔ کیوں کہ اس کا کمرہ بند نہیں ہوتا۔ اس لیے مراد بُرج جوزا کے
جنوب میں صورت جبار ہے۔ عرب اس کو مجاز أجواز کہتے ہیں، اور اسی کے اردگرد نہایت خوب صورت اور درخشاں
کمر بند ہے۔ عرب اس کو نطاق الجواز کہتے ہیں۔ یا منطقۃ الجواز۔ جواز کی یہی شرح حافظ کے اس مصرع کی ہے

"جواز سحر نہاد حمایل برابرم"

رہا اور حیلہ و تدبیر سے امیر مبارز الدین کی قوت کو ختم کرنا چاہا لیکن بار بار منہ کی کھانی پڑی۔ ہر بار اُس کے سپاہی سخت جانی اور مالی نقصان اُٹھاتے رہے۔ اور آخر کار شیراز میں عیش و طرب لہو و لعب میں مشغول ہو کر طویل اور بے سود جد و جہد میں صرف کی گئی جسمانی طاقت اور عمر کا ازالہ کرنے لگے۔ اگلے صفحوں میں تفصیل سے اس بات کا ذکر ہوگا کہ حافظ شاہ شیخ ابو اسحاق کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ فی الحال اس امر کی طرف اشارہ کیا جائے گا کہ حافظ کا ایک قصیدہ اس مطلع کا ہے۔

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد

اس کے نفس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے یہ قیصدہ اُن دنوں کہا ہے جب شاہ ابو اسحاق مبارز الدین کے ہاتھوں پے در پے شکست کھانے کے بعد افسردہ خاطر اور دل سرد ہو چکا تھا۔ چناں چہ قصیدہ میں شاہ شیخ ابو اسحاق کی مدح کے ساتھ ساتھ اس کی شکست کی علت بھی بتائی گئی ہے اور پیش آمدہ مصائب کو امتحان اور امتنان الٰہی بتایا ہے۔ فلسفیانہ انداز میں ناکامی کو صفائے قلب کے لیے ایک طرح کی ریاضت مانا ہے اور شاہ کو آئندہ وقت میں اُمیدوار رہنے کی تلقین کی گئی ہے دشمن کی گستاخی کو عنقریب رسوائی اور خواری میں مبدل ہونے کی بشارت دی گئی اور آخر کار شاہ ابو اسحاق کے لیے دعائے خیر مانگی گئی ہے اور عمر و دولت کو ایک آسمانی عطیہ کہہ کر اِن کی دوام کی تمنا کی گئی ہے۔

اس قصیدہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ عام طور پر شاعر ممدوح کی فتح و نصرت پر زوردار قصیدہ لکھتا ہے اور اس لحاظ سے مضمون میں بڑی وسعت ملتی ہے لیکن اس صورت کے برعکس حافظ نے ممدوح کے شکست کھانے اور دل سرد ہونے کے موقعہ پر زیر نظر قصیدہ لکھا ہے۔ ظاہر اِن کے سامنے اس لحاظ سے وسعت مضمون کی گنجائش نہیں۔ لیکن قصیدہ کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ حافظ نے ممدوح کی

شاہ ترکان چو پسندید و بہ چاہم انداخت　　　　دستگیر ار نشود لطف تہمتن چہ کنم

....

سوختم در چاہ صبر از بہر آن شمع چگل　　　　شاہ ترکان فارغست از حال ما کو رستمی

۷۵۴ ہجری میں امیر مبارز الدین بھاری لشکر لے کر فارس پر حملہ آور ہونے لگا۔ اس خبر سے شاہ شیخ ابو اسحاق فکر مند ہوا۔ درباریوں میں سے مولانا عضد الدین ایجی نے اُسے مبارز الدین کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ دیا۔ ابو اسحاق نے مولانا مذکور کو ہی اس کام کے لیے مامور کیا۔ لیکن وہ مبارز الدین کو ابو اسحاق کی پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے پر رضا مند کرنے میں ناکام رہا۔

کہا جاتا ہے کہ جن ایام میں مولانا عضد الدین ایجی مبارز الدین کی اُردوگاہ میں صلح و آشتی کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اُنہی دنوں شاہ شجاع نے مولانا عضد الدین ی مشہور تالیف ''شرح مختصر ابن حاجب'' کو اُس کے پاس پڑھا۔ شاہ شجاع کو کسب علم کا بڑا شوق تھا۔ علم و ادب کا جو کچھ حصہ اُسے نصیب ہوا تھا، وہ اُسی مولانا عضد الدین کی صحبت اور اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کی مدد سے ملا تھا۔ ورنہ وہ نہ تو کبھی باہتمام مکتب میں گیا تھا اور نہ کسی اُستاد کے پاس زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ اسی لیے حافظؔ نے ایک غزل میں اُس کی ستائش کرتے ہوئے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

بہر حال امیر مبارز الدین اور شاہ شیخ ابو اسحاق کے درمیان خصومت بڑھتی ہی گئی اور مبارز الدین کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع اور ابو اسحاق کے درمیان پہلی مڈ بھیڑ انہی ایام میں شوشتر اور شیراز کی شاہراہ پر واقع ہوئی، جب امیر مبارز الدین نے شیراز کی مہم اپنے بیٹے کے سپرد کر دی تھی۔ اس زد و خورد میں ابو اسحاق کو پسپا ہونا

مذاق جانش ز تلخی غم شود ایمن
کسی که شکّر تو در دهان گیرد

زعمر برخورد آنکس که در جمیع صفات
نخست بنگرد آنگه طریق آن گیرد

چو جای جنگ نبینید به بجام یاز دوست
چو وقت کار بود تیغ جان ستان گیرد

ز لطف غیب بسختی رُخ از امید متاب
که مغز نغز مقام اندر استخوان گیرد

شکر کمال حلاوت پس از ریاضت یافت
نخست ور شکن تنگ ازان مکان گیرد

در آن مقام که سیل حوادث چپ و راست
چنان رسد که امان از میان کران گیرد

چه غم بود بهمه حال کوه ثابت را
که موجهای چنان قلزم گران گیرد

اگرچه خصم تو گستاخ میرود حالی
تو شاد باش که گستاخیش چنان گیرد

که هر چه در حق این خاندان دولت کرد
جزاش در زن و فرزند و خانمان گیرد

زمان عمر تو پابند باد کاین نعمت
عطیه ایست که در کار انس و جان گیرد

۷۵۳ھ ہجری کے اواخر میں امیر مبارز الدین نے وقت کو اپنے دیرینہ حریف یعنی شاہ شیخ ابواسحاق پر حملہ کرنے کے لیے مناسب خیال کیا، اور اسی غرض سے خود کرمان میں گرمسیر کی نواحی کی طرف چلا گیا اور اپنے بیٹے جلال الدین شاہ شجاع کو اپنا والی عہد مقرر کیا۔ اس اقدام کی دلیل یہ تھی شاہ شجاع ماں کی طرف سے قراختائی ترکوں کی نسل سے تھا جو کرمان پر حکمران تھے۔ گزشتہ اوراق میں اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ نے شاہ شجاع کو بعض اوقات شاہِ ترکان کے لقب سے یاد کیا ہے۔

---

[1] عجیب اتفاق ہے کہ مظفری خاندان کے تمام شہزادے اور شہزادیاں امیر تیمور کے حکم سے اصفہان کے نزدیک ماھیار نام کے گاؤں میں قتل کیے گئے اور اس خاندان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ یہ واقعہ ۷۹۵ ہجری میں رونما ہوا، اور حافظ کی پیش گوئی درست نکلی

غزل ۷۵۴ ہجری سے پہلے کی ہو، جب کہ حافظ کی عمر پچیس برس کے آس پاس کی تھی۔ مطلع یوں ہے۔

کنون کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

خواجہ عماد الدین کرمانی کی شرح حال کے بارے میں کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں البتہ معیار جمالی نام کی ایک کتاب شمس فخری کی تالیف ہے جو ۷۴۴ ہجری میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں عماد الدین کے بارے میں ایک جگہ مختصر سا ذکر آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے پایہ کا علم دوست اور فاضل شخص تھا۔

بہر حال خواجہ عماد الدین کے فتنہ کو ختم اور شیراز کے نظم ونسق کو بحال کرنے کے بعد شاہ شجاع نے اصفہان کا رُخ کیا، اور اا پنے باپ سے جا ملا۔ شیراز سے کچھ ہی فاصلے پر کہندژ یا پہندژ نام کے قلعہ کو غارت کر دیا گیا۔ جہاں شاہ شیخ ابو اسحاق کا دفینہ موجود تھا، امیر مبارز الدین اور اس کے بیٹے شاہ شجاع دونوں نے اصفہان کا محاصرہ کیا لیکن شدید زمستان کی وجہ سے انھیں شیراز آنا پڑا۔ اگلے سال کے محاصرے کے وقت ابو اسحاق پرُمستان اور پھر شوشتر کی طرف چلا تھا۔

۷۵۸ ہجری تک اِن دو قدیم حریفوں کے درمیان اصفہان اور دیگر نواح میں جنگ وجدل ہوتی رہی۔ اور آخر کار اسی سال اصفہان پر مظفریوں کا قبضہ ہوا۔ اِن طویل محاصروں اور مڈبھیڑوں کے دوران اصفہان کے لوگوں پر بڑی آفت نازل ہوئی اور وہ سراسیمگی سے دوچار ہوئے۔ اس آخری محاصرہ میں ابو اسحاق کو اصفہان سے فرار ہونے تک کی فرصت نہ ملی اور وہ شہر کے شیخ الاعظم اور مقتدی مولانا شیخ نظام الدین اصیل کے گھر میں روپوش ہوا۔ جاسوسوں نے اطلاع دی کہ

پڑا۔ اور وہ مایوس ہو کر اصفہان کی طرف بھاگ نکلا۔ کرمان کی حکومت شاہ شجاع کو سپرد کر کے مبارز الدین خود اصفہان میں ہی رہا۔ ادھر شاہ شجاع ابواسحاق کے ہوادار کازردن میں ایک بار پھر جمع ہوئے اور اِن کی استعانت سے فائدہ اُٹھا کر وہ شیراز پر حملہ آور ہوا۔ اعیان شہر کی ایک جماعت نے جو ابواسحاق کی طرف داری کا دم بھرتی تھی۔ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے دروازہ کازرون کو کھلوا دیا، اور ابواسحاق کی فوج ایکبار پھر فاتحانہ انداز میں شیراز میں داخل ہوئی اور آل مظفر کے حامیوں کے قتل و غارت میں جُٹ گئی۔ شیراز کے محلّہ موردستان کے لوگ شروع ہی سے مبارز الدین کے طرفدار تھے۔ ابواسحاق نے اُن کے ساتھ سختی کی، اور اُن میں سے بہت سے لوگ عورتوں کا برقعہ اُوڑھ کر فرار ہونے لگے، یا دروازہ کازرون کی طرف آ کر پناہ لینے لگے۔ صرف تین دن گزرے تھے۔ کہ شاہ شجاع کی فوج شیراز کی نواحی میں آ پہنچی اور آخر کار شہر میں داخل ہوئی۔

دونوں فوجوں کے درمیان خونریز لڑائی ہوئی اور خاص کر دروازہ کازرون کے رہنے والوں پر تو گویا آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ قتل و غارت کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ڈیڑھ سال تک اس محلّہ میں ایک بھی آدمی دکھائی نہ دیا۔ مطلع السعدین میں درج ہے کہ جو لوگ صبح کو عورتوں کا برقعہ پہن کر محلّہ موردستان سے نکل کر محلّہ کازرون میں آتے تھے شام کو وہی عورتوں کا برقعے پہن کر واپس موردستان چلے گئے۔

شاہ شیخ ابواسحاق کے وزیر خواجہ عماد الدین نے ابواسحاق کے بھانجے امیر سلغر شاہ ترکمان سے مل کر جرمائی اور ادغائی قبائل سے مدد حاصل کر کے دارا بجرد کے قریب بھاری لشکر کو جمع کیا اور شیراز کی طرف بڑھا، لیکن شاہ شجاع کی تاب مقادمت نہ لا کر اُس کو پسپا ہونا پڑا۔ خواجہ عماد الدین کی مدح میں حافظ نے ایک غزل میں کی ہے۔ جو غالباً ابواسحاق کی شکست سے پہلے کہی جا چکی تھی۔ ممکن ہے یہ

سعادت میں قتل کر دیا گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۳۷ برس کی تھی۔ وہ شعروادب سے بڑی دل چسپی رکھتا تھا اور قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے یہ دو رباعیاں کہی تھیں۔

افسوس کرمرغ عمررادانہ نماند امید بہ ہیچ خویش وبیگانہ نماند

درد اودریغا کہ درین مدت عمر از ہرچہ بگفتیم جزافسانہ نماند

....

باچرخ ستیزہ کارمستیز وبرد باگردش دہر درمیاویز وبرد

یک کاسہ زہراست کہ مرگش خوانند خوش درکش وجرعہ برجہان ریزوبرد

حافظ نے شاہ ابواسحاق کی موت کے مادۂ تاریخ میں یہ قطعہ کہا ہے۔

بلبل وسرو دسمن یاسمن ولالہ وگل

ہست تاریخ وفات شہ مشکین کاکل

خسروروی زمین غوث زمان اسحاق

کہ بہ مہ طلعت اوناز وخندد برگل

جمعہ بیت دودم ماہ جمادی الاول

درپسین بودکہ پیوستہ شداز جزو بہ کل

''بلبل وسرودسمن یاسمن ولالہ وگل کے معرعہ سے ۷۵۷ ہجری نکلتا ہے جو دراصل حافظ ابرو کی بتاء ہوئی تاریخ ہے اور مطلع السعدین روضہ الصفا اور حبیب السیر'' کے مطابق ۷۵۸ ہجری ہے، ایک سال کا فرق معلوم نہیں کیوں پڑا ہے اور تعجب ہے کہ حافظ ہی کے ایک قطعہ میں مادۂ تاریخ کہا گیا ہے۔ جس سے ۷۵۸ ہجری نکلتا ہے قطعہ یوں ہے۔

بروز کاف والف از جمادی الاولیٰ

بسال ذال دوگرنون دھا علی الاطلاق

ابواسحاق اصفہان سے باہر جا نہیں سکا ہے اور شہر میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ صاحب روضہ الصفا کا کہنا ہے کہ جب مولانا نظام الدین اصیل کو یقین ہوا کہ آخرکار جاسوس ابواسحاق کے اُس کے گھر میں روپوش ہونے کی اطلاع شاہ سلطان کو دیں گے تو وہ خود شاہ سلطان کے پاس گیا اور اُس کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ شاہ سلطان کے کارندے مولانا کے گھر میں داخل ہوئے۔ شاہ شیخ ابواسحاق باروچی خانہ میں جا کر تنور میں چھپ گیا۔ لیکن پکڑا گیا اور بڑی احتیاط سے کہ مبادا اصفہان کے لوگ بلوہ کریں اصفہان کے مضبوط قلعہ طبرک میں محبوس کیا گیا۔ امیر مبارز الدین کی ہدایات کے مطابق اس کو فوجیوں کی حراست میں شیراز بھیجا گیا اور آخرکار میدان سعادت میں امیر مبارز الدین کے حکم سے قطب الدین ضرابی نے شمشیر کے دو وار سے اس کا سرتن سے الگ کر دیا۔

میدان سعادت شیراز کے دروازہ سعادت کے باہر ایک میدان ہے جس کو اسی شاہ شیخ ابواسحاق نے بنوایا تھا۔ اس میں ایک محل بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ جس میں ابواسحاق جلوہ افروز ہوا کرتا تھا۔ صاحب روضہ الصفا نے لکھا ہے۔

"............او (ابواسحاق) را از راہ مجہول بمیدان دروازہ
استخر آوردند در ہمان موضع کہ شادروان عظمت می
افرادخت افسر سلطنت بخاک انداخت۔"

اس مقولہ کی تصدیق حافظ آبرو کی جغرافیائی تاریخی سے بھی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ حافظ کے اس قطعہ سے بھی جو ابواسحاق کے قتل کے واقعہ میں کہا گیا ہے:

میان عرصہ میدان خود بہ تیغ عدو
نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

امیر جلال الدین شاہ شیخ ابواسحاق کو ۷۵۸ھ ہجری میں جمعہ کے دن میدان

ایون وقصر وجنت وفردوس برفراشت
بروی نشستہ شاد وقدح شادمان گرفت

اِن تعریفوں کے بعد عبید زاکانی نے اس کی بدبختی او زنکبت کا پرسوز اشعار میں ذکر کیا ہے۔

اکثر تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے ابواسحاق کی دادودہش کی تعریف کی ہے۔اور اس ضمن میں کئی دل چسپ حکاتیں بھی کہی ہیں۔ اِن تذکرہ نویسوں میں حسن بن شہاب یزدی موئف جامع التواریخ حسینی، معین الدین یزدی موئف مواہب الٰہی اور محمود گیتی موئف تاریخ آل مظفر جیسے مقتدر مورخ شامل ہیں۔ شہاب الدین یزدی کی بتائی ہوئی ایک دو حکایات کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ اس سے حافظ کے ممدوح کی شخصیت کے کچھ نمایاں پہلو ہمارے سامنے آسکیں۔

(۱) ایک دن کسی نے ابواسحاق کے سامنے حاتم کی سخاوت کا ذکر کیا۔ اس نے پوچھا کہ حاتم کی کس قدر سخاوت تھی؟ جواب ملا کہ اُس نے ایک محل بنوایا تھا۔جس میں چالیس دریچے تھے۔ایک دفعہ ایک سایل نے امتحان کے طور پر شئیاً للہ کہہ کر ایک دریچہ کھٹکھٹایا۔ حاتم نے ہر ایک دریچے سے تھوڑی رقم نیچے ڈلوادی۔

یہ سُن کر ابواسحاق نے کہا کہ حاتم زیادہ سخی نہیں تھا۔ اگر سخی ہوتا تو ایک ہی دریچہ سے اتنا روپیہ نیچے پھینکتا کہ اُس گدکو اگر چالیس جگہوں سے روپیہ اکھٹا کرنے کی زحمت اُٹھانا نہ پڑتی۔

(۲) ایک بار سخت برفباری ہوئی۔شاہ ابواسحاق شکار کی غرض سے سوار ہوا۔اُس وقت بلبل کیکر نام کا ایک شخص وہاں حاضر تھا۔اُس نے رباعی کہی۔

شاہا۔فلکت بخسر دی تعیین کرد — وز بہر تو اسپ پادشاہی زین کرد
تادر حرکت سمند زرین رُخ تو — برگل نہ نہد پالی زمین سمین کرد

خدا یگان سلاطین مشرق و مغرب
خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق
سپہر حلم و حیا افتاب جاہ جلال
جمال دینا و دین شاہ شیخ ابو اسحاق
میان عرصہ میدان خود بہ تیغ عدو
نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

ہو سکتا ہے ناسخوں کی تحریف کے نتیجہ میں اِن دو قطعوں میں ایک سال کا فرق پڑا ہو چناں چہ برٹش میوزیم میں تاریخ جہان آرای غفاری کے حاشیہ پر قطعہ دوم متذرہ بالا کا دوسرا مصرعیوں درج ہوا ہے۔

''بسال ذال دو گرنون وزی الاطلاق''

۳۔شاہ شیخ ابواسحاق اینجو

شاہ ابواسحاق حافظ کا ممدوح رہا ہے۔ یہ مرد فاضل اور علم دوست انسان بذل اور سخا میں یگانہ عصر تھا اور اہل فضل و ہنر کی ہمیشہ قدر دانی کرتا رہا۔ خوبرو اور خوش اندام ہونے کے علاوہ خوش اخلاق بھی تھا۔ اس کے زمانے میں فارس نعمت اور ثروت سے مالا مال اور لوگ آسودہ حال تھے۔ اس بادشاہ کی صفات کا ذکر اس کے مشہور ہم عصر عبید زاکانی نے ایک غزل میں بڑی خوبی سے بغیر مبالغہ کیا ہے دراصل یہ غزل نہیں قصیدہ ہے چناں چہ درج ذیل اشعار سے بخوبی روشن ہوگا۔

سلطان تاج بخش جہاندار امیر شیخ
کاوازہ سخاوت وجودش جہان گرفت
درعیش ساز عادت خسرو بنا نہاد
درعدل رسم شیوہ نوشیروان گرفت
پشتی دین بقوت تدبیر پیر کرد
روی زمین بباز وی بخت جوانگرفت

عضد ایجی (صاحب کتاب مواقف) اور امیر امین الدین کازرونی بلیانی جیسے لوگ شامل تھے۔ موخر الذکر اپنے وقت کا بڑا عارف تھا۔ جس کے مریدوں میں خواجوی کرمانی بھی شامل تھا۔ چناں چہ خواجو نے اسی امین الدین کی ستائش اپنی مثنوی ''گل نوروز'' میں کھل کر کی ہے۔ یہ وہی امین الدین ہے جس کا نام حافظ نے ایک قطعہ میں ابواسحاق کے زمانے کے پانچ مشہور شخصیتوں میں شامل کیا ہے۔ یعنی

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین

کہ یمن او کارہای بستہ گشاد

البتہ اس شیخ امین الدین کازروانی بلیانی کو خواجہ امین الدین جہرمی کے ساتھ اشتباہ نہیں کرنا چاہیے۔ خواجہ امین الدین جہرمی بھی شاہ شیخ ابواسحاق کا ندیم تھا اور عبید زکانی نے اس کی بیوی کی ہجو میں کئی شنیع اشعار کہے تھے۔ عبید کی منتخب لطایف کے مقدمہ میں اس امین الدین جہرمی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:۔

''............ کہتے ہی مولانا عبید کے زمانے میں جہاں خاتوں نام کی ایک بڑی ظریف اور حریف عورت تھی جو اس کے ساتھ مناظرہ، اور مشاعرہ کرتی تھی ابواسحاق کے وزیر خواجہ امین الدین نے اس عورت کو اپنی بیوی بنانا چاہا۔ اُس نے بڑے ناز و انداز کے بعد امین الدین کی منکوحہ بننا قبول کیا۔ اس ازدواج کے موقعہ پر عبید نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھ کر بے محابا مجلس میں پڑھا اور وزیر نے بجائے سرزنش اُس کی نوازش کی۔!

وزیرا جہان قحبہ و بوفاست ترا از چنین قحبہ ای ننگ نیست

برو...... فراخی دگر راہ بخواہ خدای جہان را جہاں تنگ نیست

شاہ نے اپنے مرصع خنجر کو غلاف سے نکالا اور بلبل کیکر کے سامنے پھینکتے ہوئے حاضریں سے کہا، جو میرا وفادار ہے بلبل کو کچھ دے۔ تھوڑی ہی دیر میں پچاس ہزار دینار جمع ہوئے،

(۴) شیراز میں مسجد عتیق کے دروازے پر شاہ عاشق نام ایک شخص کی شرینی اور مٹھائی کی دکان تھی۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد شاہ ابو اسحاق مسجد سے باہر آیا اور شاہ عاشق کی دکان پر بیٹھ کر کہا۔

''من امروز دکاندار شاہ عاشقم۔ بیایید داز من نقل بخرید۔''

حاضرین میں سے ہر ایک نے مرصع خنجر، شمشیر بند، زرخالص یا مسکوکات جو کچھ پاس تھا پیش کیا۔ اور شاہ نے ہر چیز کے عوض میں مٹھی بھر شرینی دی تھوڑی ہی دیر میں ایک لاکھ دینار نقد اور جنس اکٹھا ہوئے۔

جب شاہ چلا گیا تو شاہ عاشق دکاندار نے اپنی دکان پر کھڑے ہو کر پکارا:۔

''شیراز کے لوگو! بادشاہ نے مجھے بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ میں یہ نعمت اُس کے سر کے صدقے آپ کو بخشتا ہوں۔ آو، اور میری دکان لوٹ لو۔''

یک لخت لوگ آئے اور دکان کو لوٹ لیا۔ جب ابو اسحاق کو یہ خبر ملی تو اُس نے کہا کہ شاہ عاشق مجھ سے زیادہ کریم ہے۔

چوں کہ ابو اسحاق علم دوست اور شعر فہم بادشاہ تھا اِس بنا پر عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی ایک جماعت اُس کے دربار سے تعلق رکھتی تھی۔ اِن میں عبید زاکانی شمس فخری اصفہانی (صاحب معیار جمالی ومفتاح ابو اسحاقی) قاضی

مترسل اور خاندان اینجو کا درباری منشی تھا۔ وہ شاہ ابواسحاق کا ندیم بھی تھا۔ اس کی منشات کا مجموعہ کتاب خانہ مجلس شوری ملّی ایران کے علاوہ اصفہان کے کتاب خانہ شہرداری میں مجموعہ تاج الدین احمد وزیر کے نام سے موجود ہے۔ تہران میں حاج سید نصراللہ کے ذاتی کتاب خانہ میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے۔

(۴) عبید کازانی ۔ اس کا ایک منظومہ عشاق نامہ اسی ابواسحاق کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔

عباس اقبال نے اپنے زیر اہتمام چھاپے گئے کلیات عبید زاکانی میں تقریباً بیس قصیدے ایک ترکیب بند اور ایک مرثیہ کا روئے سخن شاہ شیخ ابواسحاق کی طرف بتایا ہے۔

لیکن شاہ شیخ ابواسحاق کے معاصرین میں سب سے بڑا اور ایران کے آسمان ادب کا ہی نہیں بل کہ آسمان ادب جہان کا ایک درخشندہ ترین ستارہ حافظ شیرازی ہے ۔ اگر ابواسحاق اور آل مظفر و آل جلایر و ملوک ہرمزد وغیرہ کو حافظ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل نہ ہوتا اور اگر اُن کے اشعار میں ضمناً اِن بادشاہوں اور شاہزادوں کا ذکر نہ آیا ہوتا تو شاید اس دور کی تاریخ کے بارے میں ہم اتنا غور وخوض ہی نہ کرتے کیوں کہ ہر صدی میں ایسے سینکڑوں سلطان اور شہزادے ملکوں کے اطراف میں اُبھرتے ہیں جو سحر کے ستارے کی طرح تھوڑی دیر چمک کر ناپیدا ہو جاتے ہیں ۔ اِن کی تاریخ میں تحقیق تضیع اوقات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ حافظ نے ابواسحاق کے عہد حکومت کی تعریف اور خود شاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ کہا ہے۔

سپیدہ دم صبا بوی لطف جان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد

اِن نامور شخصیتوں کے علاوہ خواجوی کرمانی اور حافظ بھی ابواسحاق کے زمانے کے نابغوں میں شامل ہیں۔ جو کسی نہ کسی طرح اس قدرشناس علم دوست بادشاہ کے فیض سے بہرہ ور تھے۔ ایک اور شخص جس نے شاہ شیخ ابواسحاق کی مدح میں کثرت سے شعر کہے ہیں جلال الدین این عضد ایجی ہے۔ اس کا ایک قصیدہ اس مطلع کا ہے۔

یہ صحن گلشن گیتی زاعتدال بہار　　　صبا بساط زمرد فکند دیگر بار

ایک اور مدیحہ کے دو شعر یہ ہیں

شاہ عادل شیخ ابواسحاق کز القاب او　　　آب حیوان شدروان باد شمال آمد پدید

خسرو گیتی ستان کز نو بہار عدل او　　　در مزاج عنصر چار اعتدال آمد پدید

جلال الدین عضد ہی کا شاہ ابواسحاق کی مدح میں ایک اور پرزور قصیدہ خاقانی کے ایک مشہور قصیدہ کی زمین میں موجود ہے۔ پیش از ین کا یں چار طاق ہفت منظر کردہ اند/ وزفروغ مہر عالم را منور کردہ اند

ابواسحاق کے ہم عصر فضلا میں دو تین کے نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً ابوالعباس احمد ابی الخیر زکوبی جو شیراز نامہ کا موئف ہے۔ زرکوبی نے خود کہا ہے شیراز نامہ کی پہلی جلد خاندان انیجو اور خاص کر شاہ ابواسحاق کی تاریخ سے متعلق ہے یہ حصہ اب نابود ہے۔

(۲) محمد بن داوٗد آملی۔ اُس نے نفا میں الفنون فی عرایس العیون کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو علوم وفنون کے مختلف شعبوں یعنی معقول و منقول و فروع و اصول وغیرہ کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ اور شاہ ابواسحاق کے نام سے معنون کی گئی تھی۔

(۳) جلال الدین فریدون عکاشہ۔ یہ شخص اُس زمانے کا مشہور دبیر اور

ریحان بیرونی (البیرونی) نے اپنی کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر میں ذکر الفروزج عنوان کے تحت لکھا ہے۔

''...... والمختار مفد ما کان المعدن الازہری و البوسحاقی۔ (صفحہ ۱۷۰ طبع حیدر آباد دکن)

صاحب مطلع السعدین نے ۷۵۴ ہجری کے وقایع کے تحت لکھا ہے کہ امیر مبارز الدین مظفر نے جب شیراز کی لشکر کو شکست دی تو تحت گاہ سلمان یعنی فارس کی تسخیر کا ارادہ بھی کیا اور کان کہ فیروزہ ابواسحاقی کو کھودنے کا مصمم ارادہ کیا۔

خوندہ میر نے دستور الوزرا میں شاہ شیخ ابواسحاق کے شرح احول کے آخر میں حافظ کا متذکرہ بالا شعر لایا ہے۔ اُستاد علی اصغر حکمت نے درج بالا آرا سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری رائے جو پہلی سے بالکل مختلف ہے میرے اُستاد مرحوم سعید نفیسی کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بواسحاقی نام کی کوئی فیروزہ کی کان نہیں۔ یہ اشتباہ ابتدا میں نظامی کے شعر سے ہوا ہے۔ جس میں کاتبوں نے تحریف کر کے نوشجانی کی جگہ ''بوسحاقی'' لکھ دیا اور پھر لوگوں نے خیال کیا کہ ایک کان کا نام ہے جو بوسحاق سے منسوب ہے۔ چناں چہ نظامی گنجوی کا شعر یوں ہے۔

بہ فیروزہ ای نوشجا نیش داد
سخن بیں کہ در نوشجانی فتاد

استاد مرحوم کا کہنا ہے کہ فیروزۂ نوشجانی ایک گہرے نیلے رنگ کا ہیرا ہوتا ہے۔ جس کی تشبیہہ اوّل شب کی نیلی اور سیاسی مائل تاریکی سے دی گئی ہے۔ حافظ کے شعر میں خاتم فیروزہ بواسحاقی نام کی کان کے فیروزہ کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔[1]

---

[1] درمکتب استاد۔ از برنامہ ہای رادیو ایران صفحہ ۲۰۸۔۲۰۹

دو قطعے جو حافظؔ نے ابواسحاقؔ کی وفات میں کہے ہیں، اس سے پہلے درج ہو چکے۔ ایک غزل جسے دراصل رثا یہ کہنا چاہیے حافظؔ نے ابواسحاق کے زمانے کے بعد جور و جفا اور اس کی سلطنت کے غیر متوقع خاتمہ کے بارے میں بڑے سوز و گداز سے کہی ہے۔

یاد باد آنکہ سر کوی توام منزل بود	دیدہ را روشنی از خاک روت حاصل بود
راست چون سوسن وگل از اثر صحبت پاک	بر زبان بود مرا آنچہ ترا در دل بود
دل چو از پیر خرد نقل معانی میکرد	عشق میگفت بشرح آنچہ برو مشکل بود
آہ ازاں جور تطاول کہ درین دامگہ است	آہ ازان سوز و نیازی کہ خیروراں محفل بود
در دلم بود کہ بی دوست نباشم ہرگز	چہ توان کرد کہ سعی من و دل باطل بود
دوش بر یاد حریفان بخرابات شدم	خم می دیدم و خون در دل و پا در گل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سبب درد و فراق	مفتی عقل درین مسئلہ لا یعقل بود
راستی خاتم فیروزہ بواسحاقی	خوش درخشید دلی دولت مستعجل بود

دیدی آن قہقہ کبک خرامان ایدل
کہ ز سر پنجہ شاہیں قضا غافل بود

مقطع سے پہلے کا شعر بڑا معنی خیز ہے اور ہمارے مقصد کی پوری وضاحت کرتا ہے البتہ ''فیروزہ بواسحاقی'' کے متعلق ہماری تحقیق کے بعد دو متضاد رائیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی رائے یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا فیروزہ تھا۔ چنان چہ برہان قاطع میں اس کے معنی یوں آئے ہیں۔ نیشاپور میں فیروزہ کی کچھ کانیں ہیں جن میں سے ایک کو ''بواسحاقی'' کہتے ہیں۔ فیروز اللغات میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ ''ابواسحاقی فیروزہ کی ایک کان نیشاپور کے نزدیک ہے اور ابواسحاق سے منسوب ہے''۔ ابو

سرکوہی توام منزل بود'' کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔اس لیے واضح ہے کہ شاہ شیخ ابواسحاق ہی سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہوگی۔علاوہ ازین اس غزل کے ساتویں شعر میں ''کمر بستی'' کی ترکیب آئی ہے۔ایران کے بادشاہوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کمر باندھا کرتے تھے۔علاوہ ازین اس کے ساتھ مصرع دوم میں ''درر کا بش مہ نو پیک'' سے ہماری رائے کو اور بھی تقویت ملتی ہے۔

دمی باغم بسر برون جہاں یکسر نمی ارزد
بمی بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

اس غزل کے بارے میں محققوں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے محمود شاہ بہمنی سلطان دکن کو بھیجی گئی تھی۔اس ضمن میں ہم گزشتہ اوراق میں کئی باتوں کا اعادہ کر چکے ہیں۔قرائیں وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کا محرک دراصل شاہ شیخ ابواسحاق کی سیاہ بختی تھی خاص کر یہ شعر

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است
کلاہی دلکشست امابدرد سر نمی ارزد

جس کا اشارہ واضح طور پر شاہ شیخ ابواسحاق کی طرف ہے کیوں کہ صرف وہی ایک بادشاہ ہے جو حافظ کے زمانے میں فارس (شیراز) میں مارا گیا۔

یاری اندر کس نمی بینیم یاران راچہ شد
دوستی آخر کی آمد دوستداران راچہ شد

دی پیر می فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا شراب نوش وغم دل ببر زیاد

یہ تو مسلم ہے کہ حافظ کی بہت سی غزلوں میں ممدوح کا نام لیے بغیر اس کی

اصفہان کے آثارِ قدیمہ کے سابق ناظم مجد زادہ صہبا کے پاس دیوان حافظ کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ تو کہیں درج نہیں، لیکن خط کی روش اور اس کے کاغذ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ ایک ہزار صدی ہجری کے آس پاس کی کتابت کا ہے۔ اس کی غزل میں ایک شعر ہے جو صریحاً شاہ اسحاق کی مدح میں کہا گیا ہے۔ یہ شعر دیوان حافظ کے باقی نسخوں میں دیکھا نہیں گیا۔ ممکن ہے چوں کہ آخرکار مظفریوں کے ہاتھوں شاہ شیخ ابواسحاق کا خاتمہ ہوا اس لیے حافظ نے احتیاط کے طور پر اس شعر کو اپنی غزل سے نکالا ہو۔ غزل کا مطلع یہ ہے

پیش از نیت بیش ازین غم خواری عشاق بود

مہر ورزی تو با ما شہرۂ آفاق بود

اور شعر زیرِ نظر یوں ہے

پیش ازین نہ رواق چرخ اخضر بر کشند

دور شاہ کامگار و عہد بواسحاق بود

متذکرہ بالا غزلوں اور قطعوں کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن کے بارے میں قرائین کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اِن کا اشارہ بھی شاہ شیخ ابواسحاق ہی کی طرف ہوسکتا ہے۔ وہ اس فراخ دل پادشاہ کے عہد کی خوشحالی اور آسودگی کی آئینہ دار ہیں۔ ہم اگلے صفحوں میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں اتنا کہنا لازمی ہوگا کہ حافظ نے بڑی ہی ہنرمندی کے ساتھ اِن غزلوں میں تاریخی اور اجتماعی اوضاع کو شاعرانہ انگ آمیزی کے ساتھ رمز اور کنایہ میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مطلع کی غزلیں ملاحظہ

یاد باد آنکہ نہایت نظری با ما بود رقم مہر تو بر چہرہ ما پیدا بود

مضمون اور اندازِ بیان سے یہ غزل سابق الذکر غزل یعنی ''یاد باد آنکہ

طلب تھا کہ شیراز کے محاصرے کے وقت بھی مجلس عیش و نشاط جمائے بیٹھا رہتا۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں اس ضمن میں ایک دل چسپ حکایت بھی لکھی ہے۔

ایک بار امیر مبارزالدین بھاری لشکر لے کر یزد سے شیراز کی طرف چل پڑا۔ شیخ ابو اسحاق عیش و طرب میں مشغول تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ دشمن آرہا ہے حکم دیا کہ مجھے اس بارے میں کوئی نہ کچھ کہے۔ آخر کار دشمن شہر کے دروازے پر آپہنچا۔ لیکن کسی شخص میں جرأت نہ ہوئی کہ یہ خبر بادشاہ تک پہنچا سکے۔ امین الدین بادشاہ کا مقرب اور ندیم تھا۔ ایک دن اُس نے بادشاہ کو اپنے محل کی چھت پر آنے کی دعوت دی تاکہ شیراز کی بہار میں گلزار اور سبزہ زار کا نظارہ دیکھے۔ بادشاہ نے چھت پر آکر ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ دیکھا ایک عظیم لشکر شہر کے باہر ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ وزیر نے جواب دیا کہ امیر مبارزالدین شیراز پر حملہ کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ شاہ ابو اسحاق مسکرایا اور کہا۔ عجب بے وقوف آدمی ہے۔ اس موسم نو بہار میں اپنے آپ کو بھی، اور ہمیں بھی عیش اور خوشدلی سے محروم کرنا چاہتا ہے اور شاہنامہ کا یہ شعر پڑھا:۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم چو فردا شود کار فردا کنیم

شاہ شیخ ابو اسحاق کے دور حکومت اور امیر مبارزالدین کے ذریعے شیراز کے محاصرہ کے وقت یعنی ۷۵۴ ہجری میں ایک بڑا واقعہ رونما ہوا، اور وہ فارس کے اکابر میں سب سے معظم اور معروف شخص حاجی قوام الدین حسن کی موت ہے۔ تمام مورخوں نے ایران کے اس دریا دل بزرگ منش آدمی کی بہت تعریف کی ہے اور حافظ نے بھی ایک غزل کے ایک شعر میں اُس کے کرم و سخا کی صفتوں کو سراہا ہے۔

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال هستند غرق نعمت حاجی قوام ما

حاجی قوام سے متعلق کچھ معلومات ہم سابقہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں

طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں جس کی بنا پر کہا جائے کہ ایسے اشعار صرف شاہ شیخ ابواسحاق ہی سے منسوب ہیں۔ حافظ کے دیوان میں ایک سو پچاس سے زیادہ موقعوں پر شاہ، خسرو، شاہنشاہ، سلطان وغیرہ الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس لیے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ حافظ کا اشارہ کس بادشاہ کی طرف ہے۔ البتہ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک کی طرف ہوسکتا ہے جو اس کے ہم عصر تھے۔

جلال الدین مسعود شاہ اینجو۔ شاہ غیاث الدین کیخسرو، شاہ ابواسحاق، امیر مبارز الدین مظفر، شاہ شجاع، شاہ زین العابدین۔ شاہ یحییٰ، سلطان عماد الدین احمد، شاہ محمود، سلطان اویس ایلکانی سلطان احمد ایلکانی، قطب الدین تہمتن وغیرہ وغیرہ۔

یہ نکتہ بڑی حد تک معقول ہے کہ جب ایسی کسی غزل میں جس میں کسی شاہ کی طرف اشارہ ہو غور کیا جائے تو قرائیں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ مندرجہ بالا میں سے کس شاہ سے اس کا تعلق ہوسکتا ہے۔

اگرچہ خاندان اینجو میں صرف شاہ شیخ ابواسحاق ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے اپنی ذاتی قابلیت کا ثبوت دیا اور فتح شیراز کے دوران امیر حسن چوپان کا مقابلہ کرنے میں دلیری کا ثبوت دیا، لیکن اس کے باوجود کئی بڑی غلطیوں کا مرتکب ہوا جن میں سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ بار بار اور بیہودہ اور احمقانہ جنگوں میں اپنے آپ کو اُلجھایا کرتا تھا۔ چناں چہ حافظ نے اس کے قصیدہ میں ایک شعر اس طرف خفیف سا اشارہ کیا ہے۔

زعمر برخورد آنکس کہ در جمیع صفات
نخست بنگر دو آنگہ طریق آن گیرد

وہ نہ صرف بدگمان اور کم اختیاط آدمی تھا بل کہ اس قدر عیاش اور آرام

ذ نہیں تھا۔ شاہ شجاع نے چھ قوی ہیکل پہلوانوں کو اُسے گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔
اُنھوں نے مبارز الدین کو اپنی تلوار سنبھالنے کی بھی فرصت نہ دی۔ مولانا رکن الدین
نے چھلانگ لگائی اور شاہ شجاع کے سامنے سے اس کو پہچانے بغیر گالیاں دیتے
ہوئے گزرا۔ شاہ شجاع نے اُس پر تلوار کی ایک ضرب لگائی اور وہ نڈھال ہو کر گر
پڑا۔

جامع التواریخ میں درج ہے کہ جن دنوں امیر مبارز الدین تبریز پر
چڑھائی کر رہا تھا ایک دن اچانک سلطان جلایری کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔
مبارز الدین کو علم نجوم پر اعتقاد تھا اور کسی منجم نے اُسے کہا تھا کہ ایک نوجوان
قد بلند۔ ترک زادے کے ہاتھوں اُسے مصیبت اُٹھانا پڑے گی۔ سمجھا کہ شاید
اویس جلایری ہی وہ نوجوان ہے جس کی طرف منجموں نے اشارہ کیا تھا۔ فوراً
اصفہان کیطرف چل پڑا۔ راستے میں کہیں بھی توقف نہیں کیا۔ لیکن اصفہان پہنچنے پر
اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قید ہو۔ اس طرح غالباً منجم کی پیش گوئی درست ثابت
ہوئی۔ سلمان ساوجی نے امیر مبارز الدین کی اپنے بیٹے کے ہاتھوں گرفتاری کے
ضمن میں کچھ شعر کہے ہیں۔

آنکہ از کبر یک وجب می دید — از سرش تا بہ افسر ہور
آنکہ میگفت کہ شرزہ شیر منم — روز ھیجا و دیگران ہمہ گور
قوۃ الظہر پشت او بشکست — قرۃ العین کرد چشمش کور

اس میں کوئی شک نہیں کہ حافظ مبارز الدین کو اپنے ولی نعمت ابو اسحاق کا
قاتل ہونے کے علاوہ عوام کے اخلاق کو فاسد بنانے اور ریاکاری اور خرافات کے
بازار کو گرم کرنے کے لیے ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اس بنا پر اُس کے ساتھ نفرت بھی
کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس حادثے نے حافظ کے ذہن اور روح کو عذاب پہنچایا
ہوگا۔ حافظ نے بے شک امیر مبارز الدین کو اربابِ ذوق کا مزاحم سمجھا ہوگا۔ اور ہم

اور اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ کئی مورخوں کا خیال ہے کہ شیخ شاہ ابواسحاق کی بدبختی کی ایک وجہ حاجی قوام کی بے وقت موت ہے کیوں کہ اگر محاصرہ کے وقت زندہ ہوتا، تو اپنے اثر و رسوخ اور حسن تدبیر کی بنا پر ممکن تھا، امیر مبارز الدین کے ساتھ معاملہ کو سلجھا لیتا، کیوں کہ اس سے پہلے بھی ایک بار شاہ شیخ ابواسحاق پر جب دُشمن غالب ہونے والا تھا تو اسی قوام الدین نے کہا تھا۔ تا من زندہ باشم، ہیچ باکی انداشتہ باش۔

ابواسحاق کے قتل کے بعد امیر مبارز الدین فارس، عراق، یزد اور کرمان کا خود مختار اور بلا حریف بادشاہ بنا اور اس کے ساتھ ہی آذربائیجان کی تسخیر کا منصوبہ بناتا رہا۔ اس مہم میں اس کے بیٹے شاہ شجاع، بھتیجے شاہ سلطان، اور کمسن پوتے شاہ یحییٰ کا بھی ہاتھ تھا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شیراز شاہ شجاع کے ہاتھوں اور اصفہان شاہ سلطان کے ہاتھوں سر ہو چکے تھے۔ اذرائیجان پر امیر مبارز الدین کی لشکر کشی کے واقعات کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے ساتھ ہماری تحقیق کا کوئی سروکار نہیں۔ امیر مبارز الدین کا انجام نہایت عبرتناک تھا۔ وہ بدخو، غضبناک اور سفاک آدمی ہمیشہ گالی گلوچ اور بدکلامی سے کام لیتا تھا۔ اُنہی بُری اور قبیح عادتوں کی بنا پر اس کے دونوں بیٹے شاہ شجاع اور شاہ محمود اس سے بدظن ہو گئے۔

امیر مبارز الدین اصفہان میں تھا تو شاہ شجاع نے اپنے بھائی سے اس کی بُری خصلت کا ذکر کیا اور یہ مشورہ دیا کہ اس کو قید کر کے یا تو اندھا بنایا جائے یا قتل کیا جائے۔ شاہ شجاع نے یہ الزام تراشا کہ مبارز الدین نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو ولی عہد بنانے کی ٹھانی ہے۔ دو بھائیوں کی باہمی سازش کامیاب ہوئی اور امیر مبارز الدین اپنے بیٹے شاہ شجاع کے ہاتھوں ڈرامائی انداز میں گرفتار ہوا۔ محمود گیتی کا کہنا ہے کہ طلوع اافتاب کے وقت مبارز الدین اپنے کمرے میں قرآن پڑھ رہا تھا اور مولانا رکن الدین ہراتی کے علاوہ دوسرا کوئی شخص وہاں موجو

مظفر کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم تکفیر، وتذویر، ریاکاری اور ظاہر پرستی کے دور دورہ کے ختم ہونے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اس قصیدہ میں رمز و کنایہ میں سب باتیں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پورے قصیدے کو یہاں نقل کیا جائے۔

قصیدہ در مدح قوام الدین محمد صاحب اعیار وزیر شاہ شجاع

زدلبری نتوان لاف زد بآسانی | ہزار نکتہ درین کار ہست تادانی
بجز شکر دہنی ما یہاست خوبی را | بخاتمی نتوان زدم از سلیمانی
چہ گردہا کہ برانگیختی رہستی من | مباد خستہ سمندت کہ تیز میرانی
بہ ہم نشینی رندان سری فرود آور | کہ گنجہاست درین سری وسامانی
بیار بادہ رنگین کہ حکایت راست | بگویم ونکنم رخنہ در مسلمانی
بخاک پاک صبوحی کشان کہ تامن مست | ستادہ بر در میخانہ ام بدربانی
بہ ہیچ زاہد ظاہر پرست نگذشتم | کہ زیر خرقہ نہ زنار اشت پنہانی
بنام طرہ دلبند خویش خیری کن | کہ تا خداش نگہدار وازپریشانی
مگیر چشم عنایت زحال حافظ باز | وگرنہ حال بگویم بآصف ثانی
وزیر شاہ نشان خواجہ زمین وزمان | کہ خرمست بدوحال انسی وجانی
قوام دولت ودینی محمد بن علی | کہ میدرخشدش از چہرہ فریزدانی
زہی حمیدہ خصالی کہ گاہ فکر صواب | ترا رسد کہ کئی دعویٰ جہانبانی
طراز دولت باقی ترا ہمی زیبد | کہ ہمنت بنرد نام عالم فانی
اگر نہ گنج عطای تو دستگیر شود | ہمہ بسیط زمین رونہد بیرانی
ترا کہ صورت جسم ترھیولائیست | چو جوہر ملکی ورلباس انسانی
کدام پایہ تعظیم نصب شاید کرد | کہ درمسالک فکرت نہ برتراز آنی
دردان خلوت کرڈبیان عالم قدس | صریر کلک تو باشد سماع روحانی

جانتے ہیں کہ جہاں بھی ہو سکا اُس نے رمز و کنایہ میں مبارز الدین کی برائی کی۔ یہ بھی درست ہے اگر مبارز الدین شاہ شجاع کا باپ نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ حافظ اعلانیہ اس کی عیب جوئی کرتا اور اس کو بُرا بھلا کہتا۔

مندرجہ ذیل غزل کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ اُس وقت کہی گئی ہے جب امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے دورِ حکومت کا آغاز ہوا تھا۔ اس غزل اور اس طرح کی کئی اور غزلوں سے حافظ کی اُس خوشی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ریاکاریاں اور ظاہر پرستوں کی بناوٹی دین داری کے خاتمہ اور اہل ذوق اور وجدان کی آزادی کے مواقع میسر ہونے پر حاصل ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ہم درج ذیل غزل کی طرف سے اشارہ کریں گے۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش ... کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

شد آنکہ اہل نظر بر کرانہ می افتند ... ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش

بصوت چنگ بگویم آن حکایت ہا ... کہ از نہفتن آن دیگ سینہ میزد جوش

شراب خانگی ترس محتسب خوردہ ... بروی یار بنوشیم و بانگ نوشانوش

زکوی میکدہ دوشش بدوش می بردند ... امام شہر کہ سجادہ میکشید بدوش

دلا دلالت خیرت کنم براہ نجات ... مکن بہ فسق مباہات و زہد ہم مفروش

محل نور تجلی ست رای انور شاہ ... چو قرب او طلبی در صفای نیت کوش

بجز ثنای جلالش مساز ورد ضمیر ... کہ ہست گوش دلش محرم پیام سروش

رموز مصلحت ملک خسروان دانند

گدای گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

شاہ شجاع برسرِ اقتدار آیا تو اوائل ایام میں خواجہ قوام الدین محمد صاحب عیار اس کا وزیر بنا۔ حافظ نے اس کی مدح میں قصیدہ کہا ہے جس میں امیر مبارز الدین

''شیراز کی فتح کے منصوبہ سے پہلے امیر بارزالدین بم
چلا گیا تا کہ وہاں مرتضٰی اعظم سید شمس الدین علی کے
خاندان میں موجود حضرت رسول اکرم کا موئے
مبارک حاصل کرے۔ سید نے دینے سے انکار کیا،
لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ خود اس ڈبیا کو لے کر
امیر مبارزالدین کے پاس گیا جس میں آثار مقدس
رکھا گیا تھا اور کہا کہ میں نے حضرت رسول اکرم کو
خواب میں دیکھا۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ
''موی محمد بہ مولوی محمد بن بظفر دہ۔'' اس کے عوض
میں مبارزالدین نے اُسے اس کی اولاد کو بہت بڑی
جاگیر دی۔'' (صفحہ ۱۷۳)

فارس پر تسلط جمانے کے بعد امیر مبارزالدین نے زاہدوں۔ فقہوں اور مذہب داروں کا حد سے زیادہ احترام کرنا شروع کیا اور اِن کی مجلسوں میں حدیث، تفسیر اور فقہ کی بحثیں سُنتا رہتا تھا، خم اور سبو کو توڑنے اور مے خانوں کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم صادر کیا۔ امر و نہی میں مبالغہ سے کام لیا اور ریا کاری کے دروازے کھول دیے۔ چناں چہ شیراز کے اربابِ ذوق اور اصحاب حال اس کو سلطان محتسب کے لقب سے پکارتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کے بیٹے شاہ شجاع نے طنز و تقریض کے طور پر اپنے باپ کے بارے میں کہا:۔

در مجلس دہر ساز مستی پست است
نہ چنگ بہ قانون نہ دف بردست است
رندان ہمہ ترک می پرستی کردند
جز محتسب شہر کہ بی می مست است

بباغ ملک زشاخ امل بعمر دراز
شگفتہ باد گل دو دولت با آسانی

ایک محقق اپنی تحقیق کے دوران کتنا ہی غیر جانب دار رہنے کی کوشش کیوں نہ کرے علمی مباحث میں حُب اور بغض سے دور رہنے کی کتنی ہی سعی کیوں نہ کرے اس کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر کم و کاست حُب یا بُغض کی طرف مایل ہو ہی جاتا ہے۔ اور بعضِ اوقات خشک منطق پر اپنے احساسات کہ غالب آنے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم حافظ کے دوستوں اور ممدوحین کی نسبت اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے کی طرف راغب ہوں گے۔ اور جن کو وہ نفرت اور کراہت سے دیکھتے ہیں ہم بھی اِن کے تئیں ایسے ہی احساسات کو اپنے اندر پائیں۔ یعنی چوں کہ شاہ شیخ ابواسحاق کو حافظ نے شفقت اور محبت سے یاد کیا ہے اس لیے ہم بھی اس بادشاہ کی نسبت محبت آمیز احساسات رکھیں۔ حالان کہ ہمیں اس کی کچھ ضرور رساں خامیوں کا بخوبی علم ہے۔ اس طرح ہم امیر مبارز الدین کی نسبت غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کریں گے حالاں کہ اُس میں چند صلاحتیں ضرور تھیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ امیر مبارز الدین نے اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لیے ظاہر پرستی اور دینداری کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دینی امور میں بڑی دل چسپی کا دکھاوا کرتا رہا۔ عبارت اور اطاعت میں اس قدر غلو سے کام لیتا رہا کہ جمعہ کی نماز کے لیے پیدل مسجد کو جاتا۔ علاوہ ازیں اُس نے خلیفہ عباس کے ہاتھوں بیعت کی، اور خود کو نائب خلیفہ کہلوایا۔ سکہ اور خطبہ میں بھی خلیفہ کا نام لایا۔ اس سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارس میں ریا اور تذویز کا بازار گرم ہوا اور زہد فروشی اور تقوی نمائی نے گھر گھر رواج پایا۔ بعض مورخوں نے امیر مبارز الدین کو ایسے القاب سے یاد کیا ہے۔ جو ایران میں عام طور پر علمائے دین کے لیے استعمال ہوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم غنی نے ''عصرِ حافظ'' میں لکھا ہے کہ

الدین محمد شیرازی درآن زمان میفر ماید:۔"اگر چہ
بادہ فرح بخش دباد گلبیز است .... الخ ومردم را
بعلوم شرعیہ ترغیب می فرمود:

علم دین فقہ است تفسیر وحدیث　　　ہر کہ خواند غیر ازین گردد خبیث

محتسب کا لفظ امیر مبارز الدین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اکثر مورخ جو حافظؔ کے قریب العصر تھے، امیر مبارز الدین کو امر معروف اور نہی منکر میں مبالغہ سے کام لینے کی بنا پر محتسب کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔ صاحب روضہ الصفا نے صراحت سے یہ بات کہی ہے۔ شاہ شجاع کی کہی ہوئی دوبیتی اوپر درج ہو چکی ہے، لیکن حافظؔ نے ایک اور غزل مں "محتسب" کا لفظ لا کر لطیف پیرایہ میں امیر مبارز الدین کے خلاف اپنی بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔ اس غزل کے مقطع میں شاہی کا لفظ لایا گیا ہے اور اس سے شاہ شجاع مراد ہے، لیکن ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ غزل کس وقت، اور کس بادشاہ کے دور حکومت میں کہی گئی تھی۔ مطلع یہ ہے:

جان بی جلال جانان میل جہان ندارد　　　ہر کس کہ این ندارد حقا کہ آن ندارد

اور شعر زیر نظر یہ ہے۔

ای دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست است ودرحق او کس این گمان ندارد

ایسے ہی مضمون اور لب ولہجہ کی کچھ اور غزلیں دیوان حافظؔ میں ملتی ہیں۔
مثلاً

حافظؔ اس امیر کی سخت گیری اور اس کے ظاہر پرستوں اور ریا کار واعظوں اور زاہدوں کو حد سے زیادہ ڈھیل دینے پر سخت دل تنگ ہوا، اور اس سماج میں نمودار ہوئی ظاہر پرستی کے خلاف سخت شکایت کرتا رہا۔ ذیل میں ایک غزل درج کی جاتی ہے جس کے مضامین اور قرائین سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظؔ نے اسے ۷۵۷ ہجری یا ۷۵۹ ہجر میں کہا ہو۔ یہ ابواسحاق کے تنزل کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔ جب فارس میں گونا گوں تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے نتیجے میں بڑی خونریزیاں، فتنہ اور فساد بپا ہوئے۔ حافظؔ نے یہ حال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ امیر مبارزالدین کو فارس فتح کرنے کے بعد عراق اور تبریز مسخر کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ چناں چہ غزل کے مقطع سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

صراحی و حریفی گرت بچنگ افتد
بہ عقل نوش کہ ایام فتنہ انگیز است

در آستین مرقع پیالہ پنہان کن
کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است

بآب دیدہ بشوئیم خرقہ ہا ازمی
کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

مجوی عیش خوش از دور واژگون سپہر
کہ صاف این سرخم جملہ دردی آمیز است

سپہر ہر شدہ پرویزنیست خون افشاں
کہ ریزہ اش سر کسریٰ و تاج پرویز است

عراق و فارس گرفتی بہ شعر خوش حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

مطلع السعدین میں درج ہے کہ

"...........امیر مبارزالدین محمد در مملکت فارس رایت استقلال باوج جلال برافراشت وسادات علمارا معزز وموقر داشت و در امر معروف بہ نہی منکر بنوعی نمود کہ کس را یارا نبود کہ نام ملاہی و مناہی بر د مولانا شمس

تلاوت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

روضتہ الصفا کے موئف نے شاہ شجاع سے نقل قول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے اپنے باپ امیر مبارز الدین سے پوچھا کہ کتنے لوگوں کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُتارا ہے؟ کہا میں نے آٹھ سو آدمیوں کے سر قلم کیے ہیں۔

جن شاعروں نے امیر مبارز الدین کی مدح کی ہے ایک کے سوا باقی سب گمنام ہیں، وہ ایک خواجوی کرمانی ہے، جس کی کلیات میں ایسے مدحیہ اشعار کی خاصی تعداد ہے، جن کو امیر مبارز الدین سے نسبت دی جاتی ہے۔ صنایع الکمال میں ایک مدحیہ قصیدہ ہے جس کے یہ دو شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

چون پدید آمد ز زیر ہفت چتر مستدیر
طلعت سلطان زرین، تاج زنگاری سریر

از فراز سبز خنک چرخ برخاک اوفتاد
دز تواضع بوسہ زوبر نعل یکران امیر

خواجو کے ایک اور پُر زور قصیدے کا مطلع اور دو شعر یوں ہیں:۔

چو عنقای خورشید را پر بلرزد
سرزال زرینہ افسر بلرزد

چرا این دل ختہ ہردم زجورت
در ایام شاہ مظفر بلرزد

محمد جہانگیر محمود رتبت
کہ از ہیبتش ملک سنجر بلرزد

..............الخ

۴۔ شاہ شجاع:۔

جلال الدین ابو الفوارس شاہ شجاع کی ماں خان قتلغ مخدوم شاہ کرمان

(۱) دانی کہ چنگ دعود چہ تقریر میکنند پہنان خورید بادہ کہ تعزیر میکنند

قرائین سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل تین غزلیں بھی واضح طور پر امیر مبارز الدین ہی کے دور حکومت میں کہی گئی ہیں:۔

بود آیا کہ در میکدہ ھا بکشایند
گرہ از کار فرد بستہ ما بکشایند

مرا مہر سیہ چشمان ز سر بیرون نخواہد شد
قضای آسمانست این است و دیگر گون نخواہد شد

وقت راغنیمت دان ہر آنقدر کہ بتوانی
حاصل از حیات ای جان این دم است گردانی

اگرچہ حافظؔ کی کوئی ایسی غزل نہیں جس کو ہم سراپا امیر مبارز الدین کی مدح کہہ سکیں لیکن اُن کے کچھ ہم عصر شعرا نے اس امیر کی مدح میں کچھ قصیدے ضرور کہے ہیں۔ یا کچھ مدحیہ قطعات اور اشعار باقی چھوڑے ہیں۔ حالاں کہ مورخ اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ بہت ظالم اور سنگدل تھا۔ حافظؔ ابرو کا کہنا ہے کہ وہ ایسی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا کہ شتربان شرماتے تھے۔

مولانا صدر الدین عراقی کا بیٹا مولانا لطف اللہ امیر مبارز الدین کے سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کا قول ہے کہ میں نے بارہا دیکھا، امیر مبارز الدین تلاوت قرآن میں مشغول ہے۔ اور اسی اثنا میں کسی مجرم کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے۔ وہ تلاوت سے اُٹھ کر مجرم کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا ہے اور پھر

حسین رشیدی کو دیا گیا۔ حافظ نے اسی قوام الدین محمد صاحب عیار کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے اور کئی غزلوں میں اس کا نام لیا ہے۔ اس کی وفات پر ایک قطعہ بھی لکھا ہے جس سے سال وفات اخذ ہوتا ہے۔ اِن اشعار کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ حافظ اس وزیر کے دوستوں اور بہی خواہون کے حلقہ میں شامل تھا۔ صاحب عیار کی مدح میں قصیدے کو ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔ ذیل کے مطلع کی غزل میں حافظ نے اپنے مخصوص انداز میں ممدوح کو معشوق کا قایم مقام ٹھہرا کر اس کی تعریف کی ہے

بحسن وخلق وفا کس بیار ما نرسد
ترا درا این سخن انکار کار ما نرسد

درج ذیل غزل کے بارے میں بھی گمان ہے کہ شاعر کا روئے سخن اسی صاحب عیار کی طرف ہے۔ بقول غنی یہ غزل لطافت زبان اور طرز ادا کے لحاظ سے حافظ کی بہترین غزلوں میں شامل ہے۔

آنکہ رخسار ترا رنگ گل ونسرین داد　　　صبر وآرام تواند بہ من مسکین داد

....

درکف غصہ دوران دل حافظ خونشد　از فراق رخت ای خواجہ قوام الدین داد

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس غزل کے مقطع میں لائے گئے نام کے بارے میں وثوق سے کہا نہیں جا سکتا کہ آیا یہ محمد صاحب عیار ہے یا حاجی قوام الدین حسن یا کوئی تیسرا شخص۔ البتہ ایک دلیل ہمارے اس ظن کی تائید کرتی ہے کہ محمد صاحب عیار کی طرف ہی روئے سخن ہونا چاہیے۔ غزل کا پانچواں شعر اس درد ناک اور فجیع حادثہ کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جس کے نتیجہ میں قوام الدین صاحب عیار کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔

کے قراختائی سلسلہ کے حکمران قطب الدین شاہ جہان کی بیٹی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ترک زادہ کہلاتا تھا اور ابوالفوارس کا لقب تھا جو دراصل اس کے ممدوحین کا تراشا ہوا تھا۔ جن میں حافظؔ بھی شامل تھا۔ آغاز جوانی میں اس شہزادے کی تربیت امیر مبارزالدین محمد بن علی صاحب عیار کو سونپ دی گئی تھی، جو بعد میں اس کا وزیر بنا۔

شاہ شجاع کا دورِ حکومت ۷۵۸ ہجری سے شروع ہوا۔ اس نے عراق، عجم، کرمان اور فارس کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کیا۔ ابتدا میں اُسے اوغانی اور جرمائی قبائل کی سرکوبی کرنا پڑی، ۔ یہ تاتاریوں کے دو قبیلے تھے جو منگول دور میں کرمان کی حفاظت کے لیے وہاں رکھے گئے تھے۔ چوں کہ انھیں مالیات کی ادائیگی سے معاف کیا گیا تھا اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت قوی ہو گئے اور برسرِ اقتدار حکمرانوں کے لیے زحمت کا باعث بنتے رہے۔ پہلے ایک بار کہا گیا ہے کہ خونی رشتہ کے باوجود اوغانی اور جرمائی قبائل جب بھی موقع پاتے شاہ شجاع کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔ شاہ شجاع کے بھتیجے شاہ یحییٰ نے بھی دوبار سرکشی کی اور شاہ شجاع نے اپنے وزیر حاجی قوام الدین صاحب عیار کو اس کی سرکوبی کے لیے مامور کیا۔ وزیر نے شاہ یحییٰ پر قافیہ تنگ کیا اور آخرکار شاہ شجاع نے دونوں بار اپنے بھتیجے کو معاف کیا۔ بچپن میں شاہ شجاع کی تعلیم و تربیت حاجی قوام الدین صاحب عیار ہی کے سپرد تھی۔ رفتہ رفتہ وزیرِ اعظم کے عہدہ تک پہنچ گیا اور شاہ کا معتمد خاص بنا۔ وہ کرمان اور یزد کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ آخرکار شاہ شجاع نے اس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے بدظن ہو کر اور کئی حاسدوں کے اثر میں آ کر اس وزیر اور عقلمند دوست کو قید کروا دیا۔ اس کی جائیداد جو بہت بڑھ چکی تھی ضبط کروائی گئی۔ اور ۷۶۴ ہجری میں بڑے عذاب اور شکنجہ میں ڈال کر اس کو مارا گیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے کیے گئے اور ملک کے ہر حصے میں ایک ٹکڑا بھیجا گیا۔ وزارات کا عہدہ کمال الدین

آنکس کہ بجہان چشم تو آسیب رساند

او نیز بعینہہ مکافاتش دید

شاہ محمود کی طاقت بڑھ گئی اور اب اُس نے فارس کی تسخیر کا عزم کیا۔اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے سلطان اویس ایلکان تبریز اور بغداد کا حکمران، امیر غیاث الدین منصور انیجو اور شاہ نصرت الدین یحیٰ کے علاوہ اور بھی کئی سرداروں کو اپنے ساتھ ملایا۔۷۶۵ ہجری میں وہ اصفہان سے فارس کی طرف چل پڑا۔شاہ شجاع جنگ کے لیے آمادہ نہ تھا۔اس لیے تذکرو تنبیہہ اور پندونصائح سے اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔کہ دوسروں سے متوصل ہوکر اپنے خاندان کو کمزور نہ کرے۔حافظ آبرو نے تاریخ جغرافیائی میں اُس منظوم خط کے کچھ اشعار روج کیے ہیں جو شاہ شجاع نے اس موقعہ پر شاہ محمود کو بھیجا تھا۔لیکن شاہ محمود نے صلح اور تفہیم کے راستے بند کر دے۔ناچار شاہ شجاع کو اپنے لشکر کے علاوہ فارس اور لار کے قبایل کو اکھٹا کرنا پڑا تا کہ حملہ آور کا مقابلہ کر سکے۔اس موقعہ پر اُس نے ایک منظومہ کہا تھا۔جس کے چند اشعار یوں ہیں۔

ابوالفوارس دوران منم شاہجہان

کہ نعل مرکب من تاج قیصراست وقباد

منم کہ نوبت آوازہ صلابت من

چوصیت ہمت من در بسیط خاک افتاد

چو مہر تیغ گزارد چو صبح عالم گیر

چوعقل راہ نماد چو شرع نیک نہاد

......الخ

شاہ محمود کی متحدہ فوجوں کا پلہ بھاری رہا اس کے کہنے پر شاہ شجاع شیراز سے ابرقو چلا گیا اور شہر کے دروازے مخالفوں کے لیے کھول دیے گئے۔ابرقو میں

اس کے برعکس حاجی قوام الدین حسن قدرتی موت مرا تھا۔ غزل کا دوسرا شعر بھی نہایت لطیف اور غیر محسوس طریقہ سے صاحب عیار پر شاہ شجاع کے ستم کی طرف اشارہ ہے۔ درجہ ذیل قطعہ، حافظ نے صاحب عیار کی تاریخ وفات میں کہا ہے جس سے ۷۶۴ ہجری حاصل ہوتا ہے۔

اعظم قوام دولت و دین آنکہ در برش | از بہر خاک بوس نمودی فلک سجود
با آن وجود و آن عظمت زیر خاک رفت | در نصف ماہ ذی قعد از عرصہ وجود
تا کس امید جود ندارد دگر ز کس | آمد حروف سال وفاتش امید جود

ذیل میں درج قطعہ کو محمد صاحب عیار کی قتل کے بعد کہا گیا تھا۔

گدا اگر گہر پاک داشتی دراصل | بر آب نقطہ شرمش مدار بایستی
در آفتاب نکردی فسوس جام زرش | چرا تہی ز میِ خوشگوار بایستی
زمانہ گرنہ زرقلب داشتی کارش | بدست آصف صاحب عیار بایستی

شاہ شجاع کا چھوٹا بھائی شاہ محمود بڑا جاہ طلب تھا اور اپنے باپ سے ورثہ میں ملے ہوئے حصہ پر قانع نہ تھا۔ چناں چہ شاہ شجاع کے ساتھ برملا متخاصمانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کرنے لگا۔ بل کہ ایک بار اصفہان میں شاہ شجاع اور شاہ سلطان کو شکست دینے میں کامیاب بھی ہوا۔ شاہ سلطان اس جنگ میں قیدی بنا اور شاہ محمود کے حکم سے اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ پانچ سال قبل اسی شاہ سلطان نے شاہ محمود کے باپ امیر مبارز الدین ک آنکھیں نکلوائی تھیں، اور اس واقعہ پر مولانا صدرالدین عراقی نے کہا تھا

گر دست فلک چشم ترا میل کشید
در ذات شریف جہان نقص ندید

نسیم باد شمال دوشم آگہی آورد | کہ روز محنت وغم روبکوتہی آورد
بہ ہمرہان صبوحی دہیم جامہ چاک | بدین نوید کہ بادسحرگہی آورد
بیابیا کہ تو حور بہشت رارضوان | درین جہان زبرای دل رہی آورد
ہمی رویم بشیراز باعنایت بخت | زہی رفیق کہ بختم بہ ھمرہی آورد
بجبر خاطر ماکوش کہ این کلاہ نمد | بسا شکست کہ با فسر شہی آورد
چہ نالہا کہ رسید از دلم بخرمن ماہ | چوبادعارض آن ماہ خرگہی ااورد

رساند رایت منصور بر فلک حافظ
کہ التجا بہ جناب شہنشہی آورد

شیراز کے لوگ شاہ محمود کے ظلم سے تنگ آچکے تھے۔ شاہ شجاع ایک سال سے وہاں نہ تھا۔ شاہ محمود میں اپنے باپ امیر مبارز الدین کی ساری بُری خصلتیں موجود تھیں۔ وہ سفاک، بدکار اور کینہ پرور تھا۔ نہ حسن تدبیر کے زیور سے آراستہ تھا اور نہ ہی قوت عزم سے۔ از بس حریص تھا اور شیراز میں آخر کار جلاری سرداروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ اِن سرداروں اور اُن کے لشکریوں کی غرض لوٹ کھسوٹ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ایسے حالات میں شیرازیوں نے شاہ شجاع کو لازمی طور پر ترجیح دی اور اس بنا پر اُنھوں نے کلوحسن کی قیادت میں ایک وفد کرمان میں شاہ شجاع کے پاس بھیجا کہ وہ دوبارہ شیراز پر قابض ہو جائے، اور انھیں خونخوار منگولوں اور تاتاریوں کے ظلم و جفا سے آزاد کرے۔

شاہ شجاع میں کئی خوبیاں تھیں۔ صاحب ذوق اور سخن سنج تھا۔ اس کی طبعیت میں ایک طرح کی لطافت تھی، اور سیرت میں خوش پسندی تھی۔ نہ تو سخت گیر تھا اور نہ خشک مغز، اس کی بلند ہمتی کا پتہ اس کے بعض اشعار سے چلتا ہے بطور مثال یہ چار شعر ملاحظہ ہوں۔

جلال الدین تورانشاہ نے شاہ شجاع کی نسبت اپنی صداقت اور خدمت کا اظہار کیا اور حق نمک ادا کیا۔ اُس نے اپنے تدبر اور حزم و احتیاط سے شاہ شجاع کی راہنمائی کی۔ اس وقت خرم نام کا ایک بہادر پہلوان شاہ شجاع کی خدمت میں داخل ہوا۔ ابرقو سے شاہ شجاع نے کرمان کا عزم کیا۔ جہاں گرد و نواح سے کچھ قبایل اور کرمان کے سرغنہ کچھ خوف اور کچھ خلوص نیت سے شاہ شجاع سے جا ملے اور اس کے ہاتھ مضبوط ہوئے، شبانکارہ کے حاکم اور جزیرہ ہرمز کا ملک تورانشاہ[1] بھی اس کے ساتھ ملحق ہوئے اور اس کی اطاعت قبول کی۔ ادھر شاہ شجاع اپنے ہاتھ مضبوط کرتا رہا۔ اُدھر شاہ محمود اور شاہ یحییٰ کے درمیان بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔ آخر کار شاہ یحییٰ نے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اسی اثنا میں شاہ یحییٰ کا چھوٹا بھائی شاہ منصور اپنے چچا یعنی شاہ شجاع کی خدمت میں داخل ہوا۔ دیوان حافظ میں ایک غزل ملتی ہے۔ جو غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ شاہ منصور کے شاہ شجاع سے ملحق ہونے کے واقعہ سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری غزلیں ہیں جو شاہ شجاع کے ابرقو اور دیگر نواحی میں گوشہ گیری کے ایام میں لکھی گئی ہیں۔ قرائن سے اس واقعہ کا اشارہ ایسی غزلوں میں مل ہی جاتا ہے۔ بہر صورت جس خاص غزل کو ہم اس ضمن میں زیر نظر لائے ہیں وہ یہ ہے۔

---

[1] اس توران شاہ کا سلسلۂ نسب ملوک سبا تک پہنچایا جاتا ہے۔ وہ ۷۴۷ھ ہجری میں جزیرہ ھرمز کا حاکم بنا اور تیس برس تک حکمرانی کرتا رہا۔ وہ بڑا علم دوست آدمی تھا۔ اور شہنامہ کے نام سے اپنے خاندان کی تاریخ میں ایک منظومہ لکھا جس کو اس وقت کے ایک پرتقالی سیاح بنام تشیرا (Texeira) نے دیکھا تھا
دیوان حافظ میں دو غزلیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ انکا روی سخن بھی اسی تورانشاہ کی طرف ہے

آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم — خاک می بوسم و عذر قدمش می خواہم
من کہ باشم کہ بر آن عاطر گزرم — لطفہا می کنی ای خاک درت تاج سرم

کہ جب ہم حافظ کے زمانے کے آس پاس کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمارے سامنے کئی غزلیں پردہ ذہن پر جلوہ گر ہو جاتی ہیں جن میں وقت کے کئی حادثوں یا واقعات کی طرف بلیغ اشارات ملتے ہیں۔ شیراز کے ساتھ اتنی دل بستگی رکھنے والا ہرگز اپنے احساسات اور عواطف کو زیر پردہ رکھ نہیں سکتا تھا اور وہ اپنی زبان سے نہیں تو نوک قلم سے ضرور اپنی دل کی باتیں کہہ ڈالتے ہیں۔

البتہ یہ درست ہے کہ ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں غزل فلاں تاریخی واقعہ سے وابستہ ہے یا فلاں شعر کا فلاں شخص کی طرف اشارہ ہے۔ کیوں کہ مستند اور معتبر شواہد کی عدم موجودگی میں اس طرح کا بیان غلطیوں سے خالی نہ ہوگا۔ لہٰذا اس ضمن میں ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف قیاس اور قرینہ پر ہی مبنی ہوسکتا ہے، اتنا ضرور ہے کہ ہم افراط اور تفریط سے حتی الامکان اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ بسا اوقات حدس اور قیاس صحیح ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم کچھ ایسی غزلیں درج کریں گے جو غالباً شاہ شجاع کی شیراز سے ہجرت اور شاہ محمود کے تسلط کے دوران کہی گئی ہوں۔ گویا ۷۶۵ھ ہجری سے ۷۶۷ھ ہجری تک کے زمانے کی ہوسکتی ہیں۔

۱۔ دیریست کہ دلدار پیامی نفرستاد — ننوشت سلامی و کلامی نفرستاد

....

۲۔ دیدم بخواب دوش کہ ماہی برآمدی — کز عکس روی او شب ہجران سر آمدی

....

۳۔ زہی خجستہ زمانی کہ یار باز آید — بکام غمزدگان غمگسار باز آید

....

۴۔ اگر آن طائر قدسی ز درم باز آید — عمر بگذشتہ بہ پیرانہ سرم باز آید

....

فراز قاف قناعت بگستر اتم پر — کہ جز نشیمن سیمرغ نیستم درخور

ہمای ہمت خود راز بہر سرداری — بکرگسان زمانہ چرا کنم ہمسر

درون کشور عزلت چو تختگاہ منست — کلاہ عزت باقی مرا بود افسر

بلاد مشرق و مغرب بدست آمدہ گیر

ہمان بریم ز دنیا کہ برد اسکندر

(جنگ تاج الدین احمد وزیر، کتاب خانہ شہرداری اصفہان)

اس پر آشوب دور میں شیراز کے لوگوں اور وہاں کا حال حافظؔ نے اشعار کی زبان میں نہایت ہی فصیح اور موزوں انداز میں بیان کیا ہے۔ حافظ نے نہ صرف شاہ محمود کی ستائش ہی نہیں کی، بل کہ اپنی پوری سلاست نفس اور ادبی دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے جہاں بھی موقع ملا، اشارہ اور کنایہ میں شاہ محمود کی بُرائی کی ہے، اور اس کو ''اہرمن'' یا ''دیو سیرت'' جیسی قبیح اصطلاحوں سے یاد کیا۔ شاہ شجاع کے مقابلہ میں اس کی حکومت کو ''باز'' کی ''مرغان قاف'' کے سامنے لاف زنی کے برابر کہا اور ''زاغ وزغن'' کا ''عنقا'' سے مقابلہ کرنے کے مصداق بتایا۔ جنھوں نے دیوان حافظ کا عمیق مطالعہ کیا ہو، وہ اِن کے طرز سخن اور روشن غزل سرائی کو جانتے ہوئے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح مختلف معانی و نتائج، قرائیں اور مقتضیات کو نہایت سنجیدگی اور احتیاط سے موزون الفاظ اور تعبیرات کے ذریعہ باہم پیوست کرتے ہیں۔ مثلاً ممدوح کی تعریف میں عاشقانہ مضامین لاتے ہیں۔ وہ اپنی کراہت کو رقیب، مدعی یا محتسب وغیرہ جیسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اِن بلند مضامین اور معانی کا بیان کرنے والا اور لطایف حکمی کا نکات قرآنی کے ساتھ جمع کرنے والا اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حادثوں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ جب اوضاع آشفتہ ہو جاتے ہیں تو وہ بھی آشفتہ ہو جاتے اور سکون اور ارامش میں وہ بھی خوشی اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے

دو سال کے وقفہ کے بعد شاہ شجاع پھر شیراز میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوا۔ شیراز سے طویل مدت تک دور رہنے اور مصائب کے ٹوٹنے اور صحت کی نادوستی کی وجوہات سے بہت آزردہ دل ہوا تھا۔ اِن ہی دنو کچھ ظاہر پرست زاہدوں اور صوفیوں نے جن کی اس دور میں تعداد کم نہ تھی اس کی آشفتگی اور پریشانی سے ناجائزہ فائدہ اُٹھانا چاہا۔ وہ اس کی ملامت کرنے لگے کہ اُس نے شرعی احکام اور وظایف کی عدولی کی ہے اور اپنے باپ کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کیا ہے۔، جس کے نتیجہ میں وہ مصبتیوں اور تکلیفوں سے دوچار ہوا ہے۔ جب دوسری بار شیراز پر قابض ہوا تو اِن لوگوں نے ڈرا دھمکا کر اسے مجبور کیا وہ زاہدوں، واعظوں اور شریعت کے پابند لوگوں کی تعظیم وتکریم کرے اور امر ونہی میں سستی نہ کرے۔ اس مکر کا شاہ شجاع پر بڑا اثر ہوا، اور وہ اِن ظاہر پرست دینداروں اور زاہدوں کے نزدیک آتا گیا۔..........

کبھی کبھار اس وقت کے ایک مشہور فقیہہ مولام قوام الدین عبداللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوتا تھا۔ اور ابن حاجب کی ''اصول'' پر خواجہ عضدالدین ایجی کی شرح پڑھتا۔ مسند قضا بہاءالدین عثمانی کوہ کیلوئی کے سپرد کردی۔ وہ شافعی عالم تھا۔ انہی ایام میں شاہ شجاع نے مولانا غیاث الدین گیتی کو دولاکھ دینار دے کر مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ وہاں مجاوروں کے لیے خانقاہ بنوائے اور اس کی مرقد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا خریدے۔ جامع النوریخ میں ذکر ہوا ہے کہ جب یہ خانقاہ خانۂ کعبہ کے پہلو میں بنی تو شاہ شجاع نے اس کے لیے دو عربی کے شعر کہے۔ اس نے خلیفہ المتوکل کے ہاتھ پر بیعت کی اور علمائے دین سے کہا کہ اس سلسلہ میں رسایل لکھیں۔

شیراز میں متمکن ہونے کے بعد ۷۶۸ ہجری میں شاہ شجاع نے اصفہان کا عزم کیا۔ قصر زرد کے قریب مختصر سی لڑائی کے بعد شاہ محمود اصفہان لوٹ آیا اور بھائی

۵۔خوش خبر باشی ای نسیم شمال　　　　که بما میرسد زمان وصال

....

۶۔یارب آن آہوی مشکین بختن باز رسان　　　　وآن سہی سرو خرامان بہ چمن باز رسان

....

۷۔نہ ہر کہ چہرہ برافر دخت دلبری داند　　　　نہ ہر کہ آئینہ ساز و سکندری داند

....

کلو حسن جس کو شیرازیوں نے اپنی طرف سے شاہ شجاع کے پاس بھیجا تھا اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، اور ۷۶۷ ہجری میں شاہ شجاع نے ایک لشکر جرار لے کر شیراز پر چڑھائی کی۔ شاہ محمود نے پل فسا اور پھر شہر کے باہر مقابلہ کیا۔ پہلوان خرم اور خود شاہ شجاع نے اس کی فوج کو شکست دی۔ شیراز کے لوگوں نے اور خاص کر محلّہ کلویاں کے باشندوں نے شاہ شجاع کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور اُسے ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ محمود کے معتبر اراکین شاہ شجاع سے مل گئے۔ غالباً مندرجہ ذیل مطلع کی غزلیں حافظ نے اِن دنوں میں کہی ہیں جن دنوں شاہ شجاع شیراز کے باہر میدان سعادت میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔

۱۔بملا زمان سلطان کہ رساند این دعارا　　　　کہ بشکر بادشاہی زنظر مران گدارا

....

۲۔ساقیا آمدن عید مبارک بادت　　　　وآن مواعید کہ کروی نرود ازیادت

....

۳۔سحرم دولت بیدار ببالین آمد　　　　گفت برخیز کہ آن خسرو شیرین آمد

....

۴۔ای در رُخ تو پیدا انوار پادشاہی　　　　در فکرت تو پنہان صد حکمت الٰہی

جا سکتا ہے کہ یہ اُس وقت لکھی گئی ہو گی جن وقت فتح نامہ اصفہان پر دستخط ہو چکے ہو نگے اور شاہ شجاع شیراز کو لوٹ آیا۔ گویا یہ غزل ۷۶۹ ہجری میں نظم ہوئی ہو گئی۔

ببین ھلال ماہ بخواہ و ساغر راح ۔۔۔ کہ ماہ امن و امانست و سال صلح و صلاح

عزیز دار زمان وصال را کاندم ۔۔۔ مقابل شب قدر است و روز استفتاح

نزاع بر سر دنیای دون کسی نکند ۔۔۔ با آشتی ببرای نور دیدہ گوی فلاح

دلا تو فارغی از کار خویش می ترسم ۔۔۔ کہ کس در ت نگشاید چو گم کنی مفتاح

بیار بادہ کہ روزش بخیر خواہد بود ۔۔۔ ہر آنکہ جام صبوحش نہد چراغ صباح

کدام طاعت شایستہ آید از من مست ۔۔۔ کہ بانگ صبح ندانم ز خالق اصباح

بہوی وصل چو حافظ شبی بروز آور ۔۔۔ کہ بشگفد گل بخشت ز جانب فتاح

زمان شاہ شجاع است دور حکمت و شرع

براحت ای دل و جان کوش در مسا و صباح

....

مسلسل جنگ و جدل اور پے در پے نقل و حرکت سے دونوں بھائی نڈھال ہو چکے تھے اور اِن کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ادھر جلایری سلطان اویس ایلکانی تبریز اور بغداد میں اپنی طاقت میں روز افزوں اضافہ کرتا رہا۔ آخر کار دونوں بھائیوں نے اس بڑھتے ہوئے خطرے کو بھانپ کر کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہی کہ سرکش حریف اِن کے قابو میں رہے۔ شاہ شجاع نے اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے دہری چال چلی۔ اپنے وزیر امیر مبارز الدین قورجی کو ۷۷۰ ہجری میں ایک پیغام دے کر اویس ایلکانی کے دربار میں بھیجا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ اوّل وہ مشتاق (یعنی اویس) ' آذربائیجان میں شاہ شجاع کی فوج کو مستقر ہونے کی اجازت دے تا کہ کسی دشمن کے حملے کا خوف باقی نہ رہے۔ اور اس علاقہ کا تحفظ کیا جائے۔ دوم یہ کہ سلطان اویس اپنی بہن دیا بقول) یگران بیٹی) کی

کے پاس ایک ایلچی کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں نے شیراز کسی جنگ و جدل کے بغیر دیا۔ تمہیں چاہیے ایسی ہی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اصفہان مجھے سونپ دو۔

شاہ شجاع نے یہ پیش کش مان لی۔ اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح ہوئی اور برادری کا عہد و پیمان کیا گیا۔ چناں چہ دونوں بھائیوں نے ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جو فتح نامہ اصفہان[1] کے نام سے مشہور ہے۔

حافظ نے شاہ شجاع کی مدح میں ایک پر زور قصیدہ کہا ہے۔ جو غالباً انہی ایام یعنی ۷۶۸ ہجری کے ماہ ذی الحجہ کے اواخر یا سال ۷۶۹ کے محرم کے آغاز میں کہا گیا تھا۔ چوں کہ اس قصیدہ میں کچھ تاریخی واقعات بلیغ اشارے ہوئے ہیں اس لیے ہر صاحب ذوق کو چاہیے کہ اس کے مطالعہ میں بڑے غور و خوض سے کام لے۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

شد عرصۂ زمین چو بساط ارم جوان
از پرتو سعادت شاہ جہان ستان[2]

ذیل میں دی گئی غزل کے بارے میں قرائین اور بحث مضمون کی بنا پر کہا

---

[1] اس فتح نامہ کی سبک انشاء کو اُس زمانے کی فارسی نثر کا بہترین نمونہ بتاتے ہوئے ملک الشعرا بہار نے اس بات کے اقتباسات کہ ''سبک شناسی'' میں درج کیا ہے۔

[2] حافظ نے قصیدوں میں ظہیر فاریابی کی روش اختیار کی مندرجہ بالا قصیدہ بھی ظہیر کے اس قصیدہ کی تقلید میں ہے

گیتی زفر دولت فرماندۂ جہاں — ماند بہ عرصۂ ارم و روضہ جنان

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو

زدلبری نتوان لاف زد بآسانی — ظہیر — درین ہوس کہ من افتادہ ام بنادانی

سپیدہ دم کہ صبا نوی لطف جا گیرد — ظہیر — سپیدہ دم کہ ہوا مژدۂ بہار دہد

تھا۔ یہ اس سے کب برداشت ہوسکتا تھا۔ خان سلطان نہایت خوب صورت اور چالاک عورت تھی۔ اُس نے شاہ شجاع کو اپنے خاص قاصدوں کے ذریعہ تحایف بھیجے اور اپنے شوہر سے جذبہ انتقام کے تحت شاہ شجاع سے عشق و محبت کا اظہار کرتے ہوئے اُسے شاہ محمود کے ارادوں سے باخبر کیا۔ بل کہ تاکید کی کہ فوراً اصفہان پر چڑھائی کرے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا اگر شاہ شجاع نے اصفہان پر چڑھائی کی تو وہ اس کی مدد کرے گی۔

بہ ہر صورت شاہ شجاع نے اصفہان پر چڑھائی کر دی، لیکن شاہ محمود نے عجز وانکسار سے کام لے کر اُسے شیراز سے لوٹ جانے پر مجبور کیا۔ اس کے فوراً بعد شاہ محمود کو جاسوسوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سب سازش اس کی بیوی خان سلطان کی تھی۔ لہٰذا بیوی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ سلطان اویس نے اپنی بیٹی دوندی کو ہرادل کے ساتھ اصفہان روانہ کیا جہان وہ شاہ محمود کے نکاح میں آئی۔ سلمان ساوجی اس دوندی کا مدح گو تھا۔ چناں چہ اس کی مدح میں سلمان کے ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

سایہ لطف خدا سلطان دوندی آنکہ ہست
آفتاب دین و دولت قہرمان ماءوطین

دوندی اور شاہ محمود کی شادی کے موقعہ پر بھی سلمان ساوجی نے ایک دل چسپ قصیدہ کہا۔ جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آسمان ساخت در آفاق یکی سور چہ سور
کہ ازان سور شد اطراف جہان مسرور
جبّذا سور و سروری کہ اگر درنگری
خانہ زہرہ بود برجی ازان عالی سور

شادی شاہ شجاع کے ساتھ کرنے پر رضا مند ہو جائے۔

سلطان ایلکانی کو یہ خط پسند نہیں آیا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نے اُسے ''برادر مشتاق'' اور ''آن برادر'' کے عنوانوں سے خطاب کیا تھا جو اُسے بُرا لگے، کیوں کہ وہ شاہ شجاع کو اپنے برابر کا رتبہ دینے پر رضا مند نہ تھا۔ ادھر شاہ محمود نے بھی اپنے خاص ایلچی اور وزیر خواجہ تاج الدین کو مکمل اختیارات دے کر سلطان اویس ایلکانی کے پاس اس کی لڑکی دوندی کی خواستگاری کے لیے بھیجا۔ خواجہ تاج الدین بڑا چرب زبان آدمی تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ سلطان اویس نے دوندی کو اصفہان میں شاہ محمود کے پاس روانہ کرنا مان لیا۔ دراصل شاہ محمود کو اُس کے بھائی شاہ شجاع سے الگ کرنا چاہتا تھا تاکہ اِن دونوں کے درمیان چپقلش بڑھ جائے اور اُس کے ہاتھ مضبوط ہو سکیں۔

شاہ محمود کی بیوی خان سلطان جو اینجو خاندان کے سلطان امیر غیاث الدین کیخسرو کی بیٹی تھی اپنے شوہر کے ارادوں سے باخبر ہوئی۔ اور یہ فطری امر تھا کہ اوہ اب اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اگرچہ مظفریوں نے اس کے باپ کے خاندان کو مٹا ہی دیا تھا۔ تاہم وہ اپنے شوہر کے تئیں وفادار رہی تھی۔ محمود گیتی اپنی تالیف تاریخ آل مظفر میں رقمطراز ہے کہ جس وقت شاہ محمود نے شاہ شجاع کی فوجوں کے ذریعہ شیراز کے محاصرہ سے تنگ آ کر فرار کیا اُس نے اپنے پیچھے اپنی اسی بیوی یعنی خان سلطان کو وہاں کی حکومت سپرد کر دی اور اپنے وزیر تاج الدین کو اس کی معاونت کے لیے مقرر کیا۔ خاں سلطان نے بڑی دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ چناں چہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کی کمان کرتی رہی، بل کہ ایک بار گھوڑے سے گر کر اُس کے دو دانت ٹوٹ گئے اور جبڑا زخمی ہوا لیکن فوراً پٹی کروا کے پھر سوار ہوئی اور مقابلہ کرتی رہی۔

اب چوں کہ اس کا شوہر جلایری خاندان کی ایک شاہزادی بیاہنا چاہتا

دونوں کو قید کیا جائے، کیوں کہ انھیں قتل کرنا اآسان کام ہے، لیکن بادشاہ کو چاہیے کہ اس خیانت کاری کی تحقیق کروائے۔ چناں چہ اِن دونوں ملزموں کو قید میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد شاہ شجاع نے اپنے وزیر شاہ حسن سے اس معاملہ کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ اُس نے کہا کہ میں نے تورانشاہ کے دوات دار سے دو ہزار دینار کے عوض رقعہ حاصل کیا۔ چناں چہ شاہ محمود نے اپنے ہاتھ سے اس رقعہ کے پیچھے توران شاہ پر اپنی عنایات اور خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔

خواندمیر نے دستورالوزرا میں اس واقعہ سے متعلق خط کی عبارت اور شاہ محمود کے جواب کو یوں نقل کیا ہے۔

> ''مضمون کتاب آنکہ ہرگاہ رایات پادشاہ بنواحی شیراز رسد مانبدگان دروازہ کشادہ ملازمانرا بشیراز درمی آدریم والتماس نمودہ بودند کہ جواب رقعہ برظہر قلمی شود و شاہ محمود درظہر نوشتہ بود کہ درفلاں روز موکب ہمایون کہ بظاہر شیراز خواہد رسید باید کہ ایشان بہ عاطفت ما اُمیدوار بود و در تمشیت امری کہ وعدہ کردند اہتمام بتقدیم رسانند۔''

تورانشاہ کے دوات دار کو شکنجہ میں ڈالا گیا لیکن اس نے حقیقتاً اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ دوبارہ تفتیش پر شاہ حسن نے کہا کہ توارن شاہ کے خواجہ سراؤں سے پوچھا جائے لیکن شاہ شجاع چوں کہ باہوش اور کارآزمودہ آدمی تھا بھانپ گیا کہ در اصل شاہ حسن ہی کی سازش ہے۔ کیوں کہ اس قدر اہم رقعہ خواجہ سراؤں کے ہاتھوں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اُسے شکنجہ میں ڈالا گیا اور بڑے عذاب کے بعد اس نے قرار کیا کہ وہ توران شاہ سے حسد رکھتا ہے۔ اس لیے محمود حاجی عمر منشی سے جو اپنے زمانے کا مشہور خط ساز اور رجّال تھا۔ خط لکھوا کر شاہ محمود کو بھیجا گیا تھا۔

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ شاہ محمود اپنے پر پچھتانے لگا اور اپنی مرحوم بیوی خان سلطان کی یاد میں آشفتہ حال ہونے لگا۔ دوندی نے یہ جان کر کہ شاہ محمود خان سلطان کی یاد میں بیکل ہے اس عورت کی نعش کو قبر سے نکلوا کر جلانے کا حکم دیا۔

بہر صورت دونوں فوجوں کا صحرائے چاشت میں آمنا سامنا ہوا، شاہ شجاع نے اپنے بھتیجے شاہ منصور کو فوج کی کمان دی۔ شاہ محمود نے شکست کھائی اور اصفہان کی طرف نکل گیا۔ شاہ شجاع نے شیراز کا رُخ کیا۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ رونما ہوا جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شاہ شجاع کے وزیر حسن نے اپنے رقیب خواجہ جلال الدین توران شاہ کو تباہ کرنے کی ایک سازش کی لیکن جیسے اکثر ہوتا ہے، بجائے اس کے توران شاہ اُس کے کھودے ہوئے کنویں میں گرے وہ خود اس میں جا گرا، چوں کہ جلال الدین توران شاہ حافظ کا ممدوح رہا ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف شاہ حسن کی سازش کے واقعہ کو درج کیا جائے تا کہ حافظ کے اس قصیدہ پر کچھ روشنی پڑے جو اس نے توران شاہ کی مدح میں کہا ہے۔

شاہ حسن نے یہ سازش کی کہ ایک رقعہ جو بظاہر توران شاہ اور اُس کے ایک دوست اور شیراز کے سربرآوردہ شخص خواجہ ھمام الدین محمود کی طرف مبینہ طور پر شاہ محمود کو لکھوایا گیا تھا، شاہ شجاع کی تحویل میں دلوایا گیا۔ خط میں شاہ محمود کو شیراز پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور اپنی (توران شاہ اور ھمام الدین) کی طرف سے اس کی پوری مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شاہ شجاع اس خط کے مضمون کو بڑھ کر غضبناک ہوا اور فوراً توران شاہ اور ھمام الدین کو بلوا کر اُن سے باز پرس کی۔ توران شاہ نے کہا اگرچہ خط میر خط سے بہت ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہ رقعہ ہرگز میں نے نہیں لکھا ہے۔ اور مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، توران شاہ نے عرض کی کہ اُن

کہ وہ توران شاہ کو اُس کے جلیل عہدہ سے ہرگز نہ ہٹائے اور اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرے۔

حافظ نے اس عقل مند وزیر سے بڑی محنت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔
ڈاکٹر قاسم غنی کا قول ہے کہ حافظ کی جن غزلوں میں آصف عہد، آصف دوران۔ خواجہ وزیر یا خواجہ جہان جیسے القاب اور عنوان لائے گئے ہیں۔ اگر وہ پوری طرح نہیں تاہم بڑی حد تک اسی جلال الدین توران شاہ کی طرف مشار ہیں۔ اس وزیر کی موت پر حافظ نے ایک قطعہ بھی کہا ہے۔ جس میں اُس کے اعلیٰ اخلاق، اس کی خیر خواہی، حق بینی اور حق گوئی کی تعریف کی گئی ہے۔

قطعہ یہ ہے۔

آصف عہد زمان، جان جہان توران شاہ
کہ درین مزرعہ جز وانہ خیرات نکشت
ناف ہفتہ بد واز ماہ صفر کاف والف
کہ بگلشن شد واین گلخن پر درد بہشت
آنکہ میلش سوی حق بینی وحق گویی بود
سال تاریخ وقاتش طلب از میل بہشت

ذیل میں حافظ کی اُن غزلوں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں جن میں صریحاً اور بلاشک وتردید اسی توران شاہ کا نام لے کر اس کی مدح کی گئی ہے۔

۱۔ چل سال بیش رفت کہ من لاف میرنم کز چاکران پیر مغان کترین منم

....

۲۔ گرم از دست برخیزد کہ بادلدار بشینم زجام وصل منیوشم زباغِ عیش گل چنیم

....

شاہ حسن کا گلا گھونٹا گیا اور جلال الدین توران شاہ اور ہمام الدین دونوں کو رہا کر دیا گیا۔

جلال الدین توران شاہ کی مدح میں حافظؔ کے مندرجہ ذیل قصیدہ میں تاریخی لحاظ سے کچھ معلومات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس کے مضامین سے قیاس کہا جا سکتا ہے کہ یہ توران شاہ کی زندان سے رہائی اور دوسری بار روز یر اعظم بننے کے موقعہ پر کہا گیا ہے۔ اگر چہ دیوان حافظؔ میں اسے غزلیات میں شامل کیا گیا ہے اور قصیدہ کی روشوں کو باہم پیوست کر دیا ہے۔ اور غزل نما قصیدہ کی ایجاد کی ہے۔ قصیدہ زیر نظر یہ ہے۔

خیر مقدم مرحبا ای طابر فرخندہ دم
شادمان کردی مرا لازم ترا استراقدم

خواجہ حافظؔ کی زندگی کا بہترین حصہ شاہ شجاع کے لائق و فائق وزیر جلال الدین توران شاہ کے عہد وزارت کے طویل عرصہ سے ہم عصر ہے یعنی ۷۶۶ہجری سے لے کر ۷۸۶ ہجری تک۔ بیس برس کے عرصہ تک جلال الدین توران شاہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہا۔ یہی دور حافظؔ کی زندگی اور شاعری کا پختہ کار اور نہایت سنجیدہ دور رہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایران کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی وزیر اتنی طویل مدت تک اتنے بڑے عہدے پر برقرار رہا ہو اور اس سے کبھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ کم تر وزیر توران شاہ کی طرح طبیعی موت مرے ہیں۔

مورخیں اتفاق کرتے ہیں کہ جلال الدین توران شاہ نہایت متین، عاقل خیر اندیش بردبار سلجھا ہوآدمی تھا اور اپنے وقت کے زبردست ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ چناں چہ شاہ شجاع نے دم نزع اپنے بیٹے اور ولی عہد زین العابدین کو خبردار کہا

۱۔ صوفی از پرتو می راز نہانی دانست گوہر ہر کس ازین لعل توانی دانست

....

۲۔ روضہ خلد برین دولت درویشان است مایہ محتشمی خدمت درویشان است

....

۳۔ باز آی ودل تنگ مرا مونس جان باش وین سوختہ را محرم اسرار نہان باش

....

۴۔ دردم از یار ست ودرمان نیز ھم دل فدای او شد وجان نیز ھم

....

۵۔ دوش بامن گفت پنہان کاردانی نیز ہوش وز شما پنہان نشاید کرد سر میفروش

دیوان حافظ میں موجودہ ایک اور غزل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں لائے گئے مضامین اُس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو جلال الدین تورانشاہ کو رکن الدین حسن یزدی کی طرف دشمنانہ سازش کے نتیجہ میں پیش آیا۔ حافظ نے رکن الدین کے دام تزدیر بچھانے کی طرف رمز وکنایہ میں اشارہ کیا ہے اور جلال الدین توران شاہ کی قید سے رہائی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رونق بہار اور تجدید وجوانی وغیرہ علامتوں اور عارفانہ تجاہل سے کام لیا ہے۔ اس غزل میں موضوع مخصوص کو نظر میں رکھنے کے علاوہ بڑے تنوع اور پختہ تجربوں کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ حافظ کی غزلوں میں کسی دوسرے وزیر کے لیے قید وبند اور پھر رہائی جیسے مضمون کو نہیں لایا گیا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا وزیر ایسا گزرا جو اس کے دورِ زندگانی میں قید ہو کر آزاد ہوا۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ غزل کا روئے سخن بھی واقعہ متذکرہ کے پس منظر میں جلال الدین توران شاہ ہی کی طرف ہو۔

رونق عہد شباب است دگر بستان را می رسد مژدہ گل، بلبل خوش الحان را

ای صبا گر بجوانان چمن باز رسی خدمت ما برسان سرو وگل وریحان را

۳۔ زکوی یارمی آیدنسیم بادنوروزی ازین بادارمددخواہی چراغ دل برافروزی

....

۴۔ بشنواین نکتہ کہ خوراغم آزادکنی خون خوری گرطلب روزی ننہادہ کنی

....

۵۔ تومگر برلب آبی بہوس بنشینی ورنہ ہرفتنہ کہ بینی ہمہ ازخود بینی

....

۶۔ سحرم ہاتف میخانہ زدولت خواہی گفت باز ای کہ دیرینہ این درگاھی

اِن غزلوں میں عام طور پر عارفانہ مضامین پائے جاتے ہیں مجموعی حیثیت سے اِن غزلوں پرغور کرنے سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ حافؔظ کا روئے سخن اسی وزیر کی طرف ہے کیوں کہ ادب نوازی اورخوش ذوقی کا تقاضا تھا کہ حافؔظ اپنے ممدوح توران شاہ کے تمایلات کی رعایت کرتا بخصوص جب کہ شاعرخود اُن بلند قدروں اور حسن اخلاق کا علمبردار تھا جو جلال الدین توران شاہ میں پائی جاتی تھیں۔ہم اِس طرح کے میلان پر اس کتاب کی دوسری جلد میں بحث کریں گے، جو ہم کے حافؔظ کی شاعری کے لیے مخصوص کی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن میں توران شاہ کا نام نہیں آیا ہے۔ لیکن آصف، وزیر، خواجہ وغیرہ جیسے علامتی الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اور اِن کے نفس مضمون اور حیثیت معانی کی بنا پر اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسی غزلوں کا روئے سخن بھی اسی جلال الدین توران شاہ کی طرف ہے۔ یہ غزلیں کس سال اور کن حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں کہنا اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں اور نہ اشتباہ سے خالی ہے البتہ قیاس کی بنا پر غزلوں کے مضامین سے ہی معلومات حاصل کر سکتے ہیں ذیل میں ہم ایسی غزلوں میں سے تین چار کو نقل کریں گے جو زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

حافظ نے بھی اسی سلطان کا نام ایک غزل میں لیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

خوش آمد گل دزان خوشتر نباشد   کہ در دستت بجز ساغر نباشد

اپنے بھائی شاہ محمود کی مکرر جسارتوں کے باوجود شاہ شجاع بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتا رہا اور اس کی باغیانہ حرکات کو نظر انداز کرتا رہا اور جب بھائی کی موت کی خبر اُسے ملی تو پورا سوگ منایا اور سعدی کے یہ اشعار گنگناتا رہا۔

بسیار سالہا بہ سر خاک مارود   کاین آب چشمہ آید باد صبا رود

این پیچ روز مہلت ایام آدمی   برخاک دیگران بہ تکبر چرا ردو

اس سانحہ سے متعلق شاہ شجاع نے ایک رباعی کہی تھی یعنی۔

محمود برادرم شہ شیر کمین
می کرد خصومت ازپی تاج ونگین

کردیم دو بخش تا بیا ساید خلق
او زیر زمین گرفت من روی زمین[1]

سلطان اویس ایلکانی کی موت کے بعد اس کا بیٹا سلطان حسین باپ کی ولایات کی حکمرانی پر متمکن ہوا لیکن وہ تجربہ میں اپنے باپ سے بہت پیچھے تھا اور اس کے علاوہ سہل انگار بھی تھا۔ ۷۷۷ ہجری میں شاہ شجاع نے اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کی غرض سے بھاری لشکر لے کر بتریز پر حملہ کیا۔ شاہ منصور اس لشکر کشی میں شامل تھا۔ اس نے بڑی جوانمردی کا ثبوت دیا۔ سلطان حسن کی فوج شکست کھا

---

[1] تاریخ وصاف میں درج ہے کہ یہ دوبیتی سلطان محمود غزنوی نے اپنے بھائی مسعود کی موت پر کہی تھی فصیحی خوانی نے مجمل میں اس کو سلطان مسعود بن شاہ سلجوقی سے نسبت دی ہے جس نے اسے اپنے بھائی محمود کی موت پر کہا تھا

گر چنین جلوه کند غنچه باده فروش	خاکردب در مے خانہ کنم مژگان را
ای کہ بر ماهکشی ازعنبر سارا چوگان	مضطرب حال مگردان من بی سرو سامان را
ترسم این قوم کہ بر دردکشان می خندند	در سر کار خرابات کنند ایمان را
یار مردان خدا باش کہ در کشتی نوح	ہست خاکی کہ بآبی نخرد توفان را[1]
بر واز خانہ گردون بدر و نان مطلب	کاین سیہ کاسہ در آخر بکشد مہمان را
ہر کرا خواب گہ آخر مشتی خاک است	گو چہ حاجت کہ بافلاک کشی ایوان را
ماہ کنعانی من مسند مصر آن تو شد	وقت آنست کہ بدرود کنی زندان را

حافظا می خور و رندی کن وخوش باش ولی
دام تزویر مکن چون دگران قرآن

....

۷۷۶ہجری میں دو اہم واقعات یکے بعد دیگر رونما ہوئے ۔ یعنی شاہ شجاع کے دو بڑے حریف جلایری سلطان اویس ایلکانی اور شاہ شجاع کا بھائی سلطان محمود دونوں فوت ہوئے ۔ سلطان اویس اور اس کے خاندان یعنی جلایریوں کا سب سے بڑا مدح گو شاعر سلمان ساوجی تھا۔ اس شہزادے پر اس نے ایک پُر زور مرثیہ کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ای فلک آہستہ رو کاری نہ آسان کردی	ملک ایران را بہ مرگ شاہ ویران کردہ ای

---

[1] اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے استاد سعید نفیسی کہتے ہیں۔ ''مرادان خدا باش وچوں مردان خدا متواضع وخاکسار ہستند در کشتنی خاکی ہست یعنی ہمان مقدار کہ از زمین برداشتہ اند کہ بہ ہمہ حقارت وفرد تنی کہ دارد توفان را بآبی نمی خرند یعنی آبردی برای طوفان قایل نیست او بہ توفان اہمیت ندہد و درین صورت مردان خدا ہرچہ حقیر باشند مانند آن مقدار خاکی ہستند باکی از طوفان ندارند
(درمکتب استاد۔ از برنامہ ہای رادیو ایران صفحہ ۸۳)

سلطانیہ جا کراس قضیہ کو سلجھا دے گا۔

سلطان احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا بے رحم اور خونی تھا بھائیوں اور اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ اس نے کئی اور لوگوں کو جو اس کی غرض وغایت کی راہ میں رُکاوٹ بنے تھے کالعدم کر دیا۔ اس کے باوجود وہ مملکت داری کے حسن انتظام اور ذوق شعر کی صلاحیت سے عاری نہ تھا۔ چناں چہ خود بھی بعض اوقات اکا دکا شعر موزون کرتا تھا۔ حافظ نے اس سلطان کی مدح میں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک میں صریحاً اس کا نام لیا ہے اور دوسری میں قرائین سے پتہ چلتا ہے۔ اس کا شارہ بھی اسی سلطان احمد کی طرف ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

احمد اللہ علی معدلتہ السطان   احمد شیخ اویس حسن ایلکانی

اور دوسری غزل یہ ہے۔

کلک مشکین تو روزی کہ زما یاد کند   ببرد اجر دو صد بندہ کہ آزاد کند
قاصد حضرت سلمیٰ ہ سلاست بادش   چہ شود گر بسلامی دل ما شاد کند
امتحان کن کہ بسی گنج مراوت بدہند   گر خرابی چو مرا لطف تو آباد کند
یارب اندر دل آن خسرو شیرین انداز   کہ برحمت گذری بر سر فرہاد کند
شاہ را بود از طاعت صد سالہ ہ زہد   قدر یک نفس عمری کی در وداد کند
حالیہ عشوہ ناز ز بنیا دم برد   تا دگر بار حکیمانہ چہ بنیاد کند
گوہر پاک تو از مدحت ما مستغنی است   فکر مشاط چہ با حسن خداداد کند

رہ بنردیم بہ مقصود خود اندر شیراز
خرم آن روز کہ حافظ رہ بغداد کند

ظاہر ہے کہ اس غزل میں کہیں بھی سلطان احمد کا نام نہیں آیا ہے لیکن اس

کر پسپا ہوئی اور وہ خود کسی گمنام جگہ پر چھپ گیا۔شاہ شجاع نے آذربائیجان کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔اور چار مہینے تبریز میں عیش وعشرت میں گزارے۔سلمان ساوجی نے اس موقعہ پر شاہ شجاع کی مدح اور تہنیت میں ایک طویل قصیدہ کہا۔

زہی دولت کزاقبال ہمایون چتر سلطانی　　　ہمایون فال شد بومی کہ بودش سر بویرانی

تعجب کہ سلمان ساوجی نے عمر بھر جلا یری خاندان کی خدمت اور مدح گوئی کی جس کے عوض اُن سے بڑی عنایات پاتا رہا۔لیکن جب شاہشجاع نے تبریز کو فتح کیا تو مندرجہ بالا قصیدہ اپنے قدیمی ممدوحین کے دشمن کی مدح میں کہہ ڈالا۔کہتے ہیں کہ شاہ شجاع اس قصیدہ پر بہت خوش ہوااور خاص کر مطلع تو بہت پسند آیا۔

درج ذیل حافظؔ کی غزل کے بارے میں خیال ہے کہ یہ اس وقت کہی گئی تھی جب شاہ شجاع تبریز میں وارد ہوا تھا۔

ای صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس
بوسہ زن بر خاک ان وادی و مشکین کن نفس

۷۸۴ھ ہجری میں سلطان اویس ایلکانی کے دوسرے بیٹے سلطان احمد نے اپنے بھائی جلال الدین حسن کے خلاف بغاوت کی اور اپنے خویشاوندوں اور خاندان کے بہت سے افراد کا خون بہانے کے بعد آذربائیجان پر قابض ہوا۔لازمی تھا کہ اِن حالات میں شاہ شجاع اس کی سرکوبی کرتا۔اور آخر کا دونوں فوجوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔سلطان احمد نے شکست کھائی اور پسپا ہو کر اُس نے بغداد کی راہ لی۔اور تبریز شاہ شجاع کے کمانڈروں کی تحویل میں آیا۔سلطان احمد نے صلح وآشتی کی درخواست کی جو شاہ شجاع نے قبول کی اور وعدہ کیا کہ بنفس خود

شاہ شجاع ایران کے جنوب مغربی علاقوں میں سرگرم تھا چند واقعات رونما ہونے کی بنا پر اُسے کافی صدمہ ہوا۔ اوّل یہ کہ اُس کی ماں خان قتلغ خان کی وفات ہوئی۔ اور دوم یہ کہ اس نے سرمستی کی حالت میں اپنے بیٹے سلطان شبلی کی آنکھیں نکلوانے کا حکم صادر کیا۔ عاملوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔ اگرچہ شاہ شجاع دوسرے ہی دن سخت پشیمان ہوا۔

فارس نامہ ناصری کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کو اپنے بیٹے سے بدظن کیا گیا تھا۔ اس کی صحت اِن صدمات کی بنا پر روز بروز بگڑتی گئی۔ سلطانیہ اور شوشتر کی مہموں سے واپس شیراز آنے پر اس نے بیشتر وقت مے نوشی اور شہوت رانی میں بسر کیا۔ اس سے اس کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اور اب بستر پر ہی پڑا رہا۔ غرض یہ کہ اُسے اپنی قریب الوقت موت کا یقین ہونے لگا اور پھر آخرت کے سفر کا اہتمام بھی کرنے لگا۔ سر بالین دس قرآن خوان بٹھا دیے جو ایک دن ختم قرآن کرتے تھے۔ مسکینوں اور ناداروں میں مال و خیرات بانٹنے کی ہدایات دیتا رہا۔ لوگوں میں اس خبر سے اضطراب پھیلنے لگا، شاہ شجاع نے اپنے بیٹوں اور امرا کو بلا کر انھیں امن و آشتی سے رہنے کی تلقین کی، جس کے قبضہ میں جو علاقہ تھا وہ اُسے تفویض ہوا اور شاہ زین العابدین کو اپنا ولی عہد بنایا۔ اسی اثنا میں شاہ شجاع نے اپنے ہاتھ سے ایک خط تیمور کو لکھا۔ شرف الدین علی یزدی نے ظفر نامہ میں اس عبارت کو عیناً نقل کیا ہے۔ قبل از مرگ شاہ شجاع نے وصیت کی کہ اُسے شیراز کے باہر مصلیٰ میں عارضی طور پر دفن کیا جائے اور کرمان سے امیر اختیار الدین حسن کے آنے پر میت کو اس کی نگرانی میں لے جا کر جوار قدس میں دفن کیا جائے۔ چناں چہ جنازے کے حمل و نقل، ملاحوں کی اُجرت اور مسکینوں اور ناداروں میں خیرات وغیرہ تمام تفصیل مرتب کی گئیں، اور سال ۷۸۶ھ ہجری میں شعبان مہینہ کی بائیسویں تاریخ کو فوت ہو کر چہل مقام یا چہل دختران پہاڑی کے دامن میں دفن کیا گیا۔

کے پانچویں شعر۔'' شاہ را........... الخ سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ کا روئے سخن اسی سلطان کی طرف ہوگا۔ مقطع کے بیت میں بھی بغداد کی طرف اشارہ ہے اور اگر ہمارا قیاس درست ہو تو ظاہر ہے حافظ نے یہ غزل زندگی کے آخری دور میں کہی ہے کیوں کہ سلطان احمد کے آذربائیجان کی حکومت سنبھالنے کے صرف آٹھ سال بعد حافظ کی موت ہوئی۔ غزل کی انتہائی شیرینی اور روانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاعر کی زندگی کے آخری دور کی تخلیق ہوگی۔ اس کے ایک شعر میں برابر وہی مضمون لایا گیا ہے۔ جو سابقہ غزل کے ایک شعر میں آیا ہے یعنی فارس کی شکایت اور بغداد کے سفر کی آرزو۔

ہم سلطان احمد ایلکانی کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ کر شاہ شجاع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں فتح۔ آذربایجان کے بعد شاہ شجاع ایران کے جنوب مغربی علاقوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یعنی اہواز۔ شوشتر وغیرہ کی طرف، اس کے ہرکارے سرگرم عمل رہے۔ ۷۸۴ ہجری کے اہم واقعوں میں سے ایک واقعہ امیر تیمور گورکانی کا ظہور ہے۔ وہ کلات کی نواحی سے نکل کر تربیشتر کی طرف عازم ہوا۔ یہاں اُس نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور اسی موقعہ پر شاہ شجاوع کی طرف سے امیر عمر نام کا ایک سفیر شیراز سے چل کر امیر تیمور کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ بے شمار تحایف لایا تھا اور شاہ شجاع کی طرف سے ایک خط امیر تیمور کی خدمت میں پیش کیا۔ جس میں شاہ شجاع کے اظہار خلاص اور دوستی کا ذکر تھا۔ تیمور نے شاہ شجاع کے سفیر کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور کئی تحفے دے کر واپس شیراز بھیج دیا اور اپنی طرف سے امیر حاجی خواجہ کو دوستی اور محبت کا پیغام دے کر شاہ شجاع کے دربار میں روانہ کیا، ضمناً دوستی کو مضبوط بنانے ے لیے شاہ شجاع کے خاندان کی ایک لڑکی کا رشتہ اپنے نوادہ امیرزادہ کے لیے مانگا جو شاہ شجاع نے منظور کیا۔ چناں چہ اس نے اپنی پوتی یعنی سلطان اویس کی بیٹی کو امیر تیمور کے دربار میں روانہ کیا۔ ۷۸۵ ہجری مں جب

	حافظ	شجاع
۱۔	ہاتفی از گوشہ میخانہ دوش گفت می بخشند گنہ می بنوش	شیوہ عشاق نباشد خردش گر بمثل خون دل آید بجوش
۲۔	منم کہ دیدہ بہ یدار دوست کردم باز چہ شکر گومیت ای کارساز بندہ نواز	بہر طریق کہ پیش آید نشیب وفراز توئی دلیل من ای کارساز بندہ نواز
۳۔	ای رخت چون خلد ولعلت سلسبیل سلسبیلت کرد جان ودل سبیل	ای بکام عاشقان حسنت جمیل کی گزیند بی دلی برتو بدیل
۴۔	دلم جز مہر مہر دیان طریقی برنمیگیرد زہر درمیدھم پندش ولیکن درنمیگیرد	چہ شد جانان بدین گرمی کہ سوز مہر نمیگیرد مگر فریاد مہجوران ترا در سر نمیگیرد

نقل از مجموعہ تاج الدین احمد وزیر صفحہ ۱۳۹

شاہ شجاع کی شاعرانہ صلاحت کی توصیف میں مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کے کلام کے نمونہ سے جو ہمارے سامنے ہے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اشعار سُست اور بعض واوقات بے مزہ ہیں۔ بہرکیف وہ اس قدر علم دوست اور سخن فہم ضرور تھا کہ حافظؒ نے اس کی تعریف اور مدح کی ہے۔ شاہ شجاع سے متعلق حافظؒ کی غزلوں، قصیدوں اور قطعات وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظؒ کو اس بادشاہ سے محبت تھی اور طویل مدت تک اس کا ہم عصر ہونے کی بنا پر اس کا احترام کرتا تھا۔ شاہ شجاع ۷۵۴ھ ہجری میں پہلی بار شیراز آیا اُس وقت وہ اکیس برس کا نوجوان تھا۔ اُس کی وفات ۷۸۶ھ ہجری میں ہوئی گویا شاہ شجاع اور

معین الدین یزدی (مواہب الہیٰ) محمود گیتی (تاریخ آلِ مظفر) حافظ ابرو (تاریخ جغرافیائی) کے علاوہ تاج الدین احمد وزیر کے مجموعہ کا قلمی نسخہ بھی شامل ہے اِن سب مورخوں نے طویل اور پُر تکلف عبارت میں شاہ شجاع کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ہم باقی سب سے قطع نظر کر کے روضۃ الصفا کی عبارت سے چند جملے نقل کرتے ہیں۔ جن سے اِن کی خوبیوں کا انداز ہو سکے۔

"..........شاہ شجاع بلطف طبع حسن وخلق ووفور فضل وزیور ادب دحلیہ تواضع وکمال مکرمت وطتینت پاک و فرط جود وشیمہ شجاعت متحل بود واز جبن و بد دلی و بخل وامساک وسایر افعال ذمیمہ واعمال رو یہ متخلی ......
واز ارتقا بہ زوایہ علوم و معارف یقینہ بدرجہ رسید کہ پیوستہ فضلا و دانش ورد علما فضل گستر کہ بہ مجلس ہمایونش، راہ می یافتند از لطائف خاطر قدسی صفاتش مخلوط......حافظہ اش بغایتی بود کہ ہفت ہشت بیت عربی را بیک شنیدن یاد می گرفت۔"

تذکرہ نویسوں نے شاہ شجاع کے کئی اشعار اور قطعات کو اپنی تحریروں میں درج کیا ہے۔ اس کے خطوط کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ انشا کے رموز سے بخوبی آشنا تھا۔ چناں چہ ملک الشعرا بہار نے سبک شناسی میں حافظؔ کے دور کی فارسی نثر کے اعلا نمونہ کے لیے شاہ شجاع کے ایک خط کے اقتباس کو پیش کیا ہے۔ شاہ شجاع کے دیوان یا اُس کے پراگندہ اشعار کو سعد الدین انسی نے جمع کیا اور پھر تذکرہ نویسوں نے کہیں کہیں درج کیا۔ فارسی کے علاوہ اس نے عربی میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ شاہ شجاع اور حافظؔ کی کئی غزلیں ردیف قافیہ اور ہیئت مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔

۱۔ ہاتفی از گوشہ میخانہ دوش گفت بخشند گنہ می بنوش

....

۲ قسم بحشمتِ جاہ وجلال شاہ شجاع کہ نیست باکسم از بہر مال وجاہ نزاع

....

۳ بفر دولتِ گیتی فروز شاہ شجاع کہ ہست در نظر من جہان حقیر متاع

....

۴۔ بامداوان کہ زخلوت گہ کاخ ابداع شاہ خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

ذیل میں ہم ان غزلوں کے مطلع درج کرتے ہیں جن کے بارے میں قرایں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ شجاع کی مدح میں ہیں۔

۱ آن شب قدرِ کہ گویند اہل خلوت امشب است
یا رب این تاثیر دولت از کدامین کوکب است

۲ رواق منزل چشمِ من آشیانہ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانۂ خانہ تست

۳ دلم جز مہر مہر دیان طریقی بر نمی گیرد
ز ہر در مید ہم پندش ولیکن در نمی گیرد

۴ دیدم بخواب خوش کہ بدستم پیالہ بود
تعبیر رفت و کار بدولت حوالہ بود

حافظ بتیس برس تک ہمعصر رہے۔ اگر حافظ کا سال تولد ۷۱۷ ہجری فرض کریں تو ۷۵۴ ہجری میں جب وہ پہلی بار شاہ شجاع سے متعارف ہوا تھا اُس وقت اُس کی عمر سنتیس برس کی تھی اور شاہ شجاع کی وفات کے وقت وہ اُنہتر برس کا پیر مرد تھا۔ اگر حافظ کی عمر کے پہلے پچیس سال کسب علم و ہنر میں صرف ہوئے ہوں.......... تو باقی عمر کے پچاس سال جو اُس کی شعر و شاعری کا زمانہ تھا اُس میں بتیس سال شاہ شجاع سے متعلق ہیں۔ اس قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی شاعرانہ زندگی کا دو تہائی حصہ شاہ شجاع سے وابستہ رہا ہے۔ دیوان حافظ میں تقریباً ۱۳۳ بار بادشاہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ۱۰۹ غزلوں، گیارہ قطعوں اور ایک مثنوی اور دو قصیدوں میں سلطان خسرو، پادشاہ، شہنشہ، شاہنشاہ و پادشاہ، شہریار شاہ، ملک فرمانده، دادگر وغیرہ کے عنوانوں سے بادشاہ وقت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اِن میں سے کم از کم ستر بار صراحت سے یا اطمینان بخش قرائین سے شاہ شجاع کی طرف اشارہ ہوا ہے یا اس کے علاوہ حافظ کے ہم عصر شاہزادوں اور حکمرانوں کا نام بھی آیا ہے۔

گزشتہ اوراق میں ہم نے ایک دو بار اُن قصیدوں اور قطعوں کا ذکر کیا ہے جو حافظ نے شاہ شجاع کے حوالے سے کیے ہیں۔ اب ہم ایسی غزلوں کا حوالہ دیں گئے جس میں سے کئی بار صراحت اور وضاحت سے حافظ نے شاہ شجاع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ شاہ شجاع کے دیگر معاصر شعرا نے بھی اِس کی مدح کی ہے جن میں خاص کر عماد فقیہ شامل ہے۔ سب سے پہلی غزل جس میں حافظ نے ابوالفوارس کا لقب بھی استعمال کیا ہے۔ پہلے ہی درج ہو چکی مطلع یوں ہے۔

ستارہ ای بدرخشید و ماہ مجلس شد دل رمیدۂ ما را رفیق و مونس شد
ذراما صلد دو
باقی غزلوں کے مطلع ترتیب سے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

کشی کا ارادہ کیا۔ لیکن قبل ازین کہ وہ کسی سنگین عمل کے مرتکب ہوتے شاہ یحیٰی نے زین العابدین سے صلح کی، اور زین العابدین کی فوجیں شاہ منصور کی فوجوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہوئیں۔ البتہ زین العابدین نے کازرون کی خوشحالی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، کیوں کہ شاہ منصور نے اس شہر کو غارت کیا تھا۔ آخر کار زین العابدین فاتحانہ انداز میں شیراز واپس چلا آیا۔

مطلع السعدین اور روضۃ الصفا میں اس تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے درج ہوا ہے کہ زین العابدین کی فاتحانہ واپسی پر شمس الدین حافظ نے یہ غزل کہی ہے۔

خوش کرد یاوری فلک روز داوری
تا شکر چون کنی وچہ شکرانہ آوری

مطلع السعدین کی عبارت عیناً یوں ہے۔

"......اکابر دارا ملک فارس باستقبال بارگاہ آسمان اساس آمدند و مراسم نثاری بجاہی آوردہ تہنیت این در فتح نامدار گفتند۔ مولانا شمس الدین گوید خوش کرد......الخ

ڈاکٹر قاسم غنی کہتا ہے کہ مندرجہ دو غزلیں بھی اسی زین العابدین کی طرف اشارتاً کہی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس وقت یا کس واقعہ کے پس منظر میں کہی گئی تھیں۔

سحر با بادمی گفتم حدیث آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

۵ در عہد پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

۶ ای رخت چون خلد ولعلت سلسبیل
سلسبیلت کرد جان و دل سبیل

۷ ای قبای پادشاہی راست بر بلایِ تست
زینت تاج ونگین از گوہر والای تست

زین العابدین بن شاہ شجاع :۔

مرنے سے پہلے شاہ شجاع نے اپنے بیٹے زین العابدین کو اپنا جانشین اور فارس کا بادشاہ بنایا تھا۔ ہر چند اُس نے دم نزاع اپنے بیٹوں کو بلا کر اُنھیں باہمی جنگ وجدل سے اجتناب کرنے کی تلقین کی تھی مگر ساری نصیحتیں بے کار گئیں اور اُس کی موت کے ساتھ ہی جیسے کہ متوقع تھا باہمی کش مکش کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اُس وقت زین العابدین کے علاوہ دو اور شخصوں کے نام لیے جائیں گئے جو میدان کش مکش میں وارد ہوئے یعنی شاہ شجاع کا بھتیجا اور داماد نصرت الدین یحییٰ اور دوسرا بھتیجا شاہ منصور۔ شاہ یحییٰ نے فارس اور اصفہان کو مسخر کرنے کے عزم سے بھاری فوج جمع کر لی پہلے اصفہان کے لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا، لیکن جلد ہی وہ اس سے کبیدہ خاطر ہوئے اور رفتہ رفتہ روگردانی کرنے لگے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ شاہ یحییٰ تندخو، ممسک اور سفاک آدمی تھا۔ اس میں مبازرالدین کی تمام بُری خصلتیں جمع ہو گئیں تھیں۔ ادھر شاہ منصور کو کازرون اور اس کی نواحی کی سرداری ملی تھی۔ زین العابدین کے خلاف ایک باران دونوں بھائیوں نے سازش کر کے لشکر

چندین سالہ اولاد امیر (کذا) دبدست منصور افتاد
وتخریب عمرانات وانوع بیداددر آن خطہ روی داد۔
چون بلاد وخوارزم موطن صنادید عالم وھسکن نحاریز بنی
آدم بود آوازہ خرابی انچنان دراطراف جہان اشتہار
یافت کہ بلبل دستانسرای مولانا حافظ در گلشن شیراز
باین زمزمہ آواز آوردکہ

بخوبان دل مدہ حافظ ببیں آن بی وفایہا
کہ باخوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے ابتدا میں مقطع کے بیت کو اسی طرح لکھا تھا جس طرح حاج محمد نخجوانی کے قلمی نسخہ میں درج ہوا ہے۔ لیکن شاید امیر تیمور کے فارس میں داخل ہونے کے بعد اس نے مصلحتاً بدل دیا تا کہ کہیں اشرار اس شعر کو بہانہ بنا کر موجب زحمت نہ بن جائیں۔ ایک قیاس یہ ہے کہ شاید تیمور کے ساتھ کچھ کشمیری سپاہی یا اہل حرفہ شامل تھے۔ جو حافظ کے لیے اس شعر کے محرک بنے۔

دوسری غزل جس کا اشارہ زین العابدین کی طرف ممکن ہے بہت مشہور غزل ہے یعنی

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ھند دیش خشم سمرقند و بخارارا

ملا سودی نے ترک شیرازی کی تشریح میں لکھا ہے کہ بعض شیرازیوں کا قول ہے کہ ہلاکو کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے شیراز میں سکونت اختیار کی تھی اور

اسی غزل کے مقطع کا وہ مشہور شعر ہے جس کے بارے میں محققوں اور ناقدوں کے درمیان بے نتیجہ بحث اب تک جاری ہے یعنی

به شعر حافظ شیراز می رقصند و می بازند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

حاجی محمو نخجوانی کے پاس دیوادن حافظ کا ایک قلمی نسخہ ہے جو موجود قلمی نسخوں میں قدیم ترین خیال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اس نسخہ کی کتابت ۸۰۳ھ ہجری یعنی حافظ کی وفات کے صرف گیارہ برس بعد ہوئی اس لیے عین ممکن ہے کہ حافظ کی کچھ غزلیں اس کی زندگی ہی کے دوران اس پر درج کی جا چکی ہوں۔ اس میں زیرِ نظر غزل کا مقطع یوں دیکھا گیا ہے۔

بخوبان دل مده حافظ ببیں آن بیوفایہا
کہ با خوارزمیان کردند ترکان سمرقندی

خوارزمیوں کو ترکوں کے ہاتھوں کیا کچھ دیکھنا پڑا تاریخ میں تفصیل سے درج ہے۔ کیا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ درحقیقت حافظ نے مقطع کو ابتدا میں اسی طرح کہا تھا جس طرح نجوانی کے نسخہ میں آیا ہے اور بعد میں اس کو بدل دیا۔ حافظ کے قریب العصر مورخ عبدالرزاق سمرقندی نے مطلع السعدین و مجمع البحرین میں ۷۸۱ ہجری کے حوادث کے دوران لکھا ہے کہ حافظ نے مقطع کے اس بیت یعنی بخوبان دل حمدہ حافظ.......... الخ ۷۸۱ھ ہجری کے وسط میں امیر تیمور کے ہاتھوں خوارزم کی فتح اور اس آباد شہر کی بربادی کی طرف شارہ کرتے ہوئے کہا چناں چہ اس کی عبارت عیناً یوں ہے۔

''......بطرقتہ العینی شہر خوارزم مسخر شد و خزایں و دفاین

میں بھی ملاحظہ ہوگی۔ بہرحال ہم اِن تمام غزلوں کا حوالہ دیں گے۔ جن میں صریحاً نصرت الدین شاہ یحییٰ کا نام آیا ہے۔

یک دو جامم دی سحر گہ اتفاق افتادہ بود   وزلب ساقی شرابم درمذاق افتادہ بود

....

دارای جہاں نصرت دین خسرو کامل   یحییٰ بن مظفر ملک عالم عادل

....

دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن   درکوی او گدائی برخسروی گزیدن

....

درسرای مغان رفتہ بود و آب زدہ   نشستہ پیر صلائی بہ شیخ وشاب زدہ

....

ایکہ بر ماہ از خط مشکین نقاب انداختی   لطف کردی سایہ‌ای برآفتاب انداختی

ذیل میں درج حافظ کی ایک مشہور غزل میں قراین کی بنا پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بھی شاہ یحییٰ کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس کے پس منظر میں پھر وہی بات دہرائی جاسکتی ہے۔ جو ہم نے گزشتہ سطور میں کہی۔ یعنی یہ کہ حافظ اپنے شہر سے دور یزد کے سفر کا شوق رکھتے تھے۔ شاہ یزد کا نام لے کر اس کی اور یزد کے لوگوں کی ثنا خوانی کرتے ہیں۔ لطیف پیرایہ میں مالی مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ وغیرہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ممدوح کی تعریف حافظ نے محبوب معشوق، بت، جان وغیرہ جیسے الفاظ سے کی ہے اور زیر نظر غزل میں بھی یہ روش برقرار رکھی گئی ہے

مطلع

ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما   آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

وہاں تولید نسل کرتے رہے۔ پس اِن کی اولاد کو ترک شیراز کہا جانے لگا۔ لہٰذا ترک شیرازی نہ تو تشبیہہ ہی ہے اور نہ استعارہ بل کہ وہ ترک ہے جو شیراز میں سکونت پذیر تھا۔ سودی لکھتا ہے کہ ترک فطرۃً خونخوار، ظالم اور بے رحم ہوتے ہیں۔ ایران کے شاعروں نے معشوق کو سنگدل اور بے رحم کہہ کر ترک قوم سے مشابہ کرنے کی عادت ڈالی۔

نصرت الدین شاہ یحییٰ شاہ شجاع کا بھتیجا اور داماد تھا یعنی سلطان پادشاہ کا شوہر مورخوں نے متفق ہو کر لکھا ہے کہ اصفہان کے لوگ اس کے سلوک سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ وہ یزد کی ترقی سے زیادہ دل چسپی رکھتا تھا۔ اصفہان میں جو کوئی نفیس اور عمدہ چیز نظر آتی وہ یزد بھیج دیتا۔ اس کے مقابلے میں سلطان زین العابدین کریم اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ جب اس کی فوجیں اصفہان کی گردونواح میں پہنچ گئیں تو وہاں کے امام اور مقتدی خواجہ امام الدین نے اعلان کیا کہ جو کوئی سلطان زین العابدین کی فوج پر ایک بھی تیر چلائے وہ گہنگار ہوگا۔

تعجب ہے کہ شاہ یحییٰ کے اس قدر بخیل اور حریص ہونے کے باوجود حافظ نے کئی غزلوں میں صراحت سے نام لے کر اس کی تعریف کی ہے۔ اس عجیب حقیقت پر ضرور کچھ روشنی ڈالنی چاہیے۔ یہ تو درست ہے کہ حافظ نے شاہ یحییٰ کی تعریف کی۔ لیکن معلوم نہیں ایسی غزلیں کس وقت کہی گئی تھیں۔ کیا شاہ شجاع کے ساتھ اس کی خصومت کے ایام میں کہی گئی تھیں یا اُس وقت جب حافظ شیراز سے نکل کر یزد گئے تھے۔ اِن سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب ملنا بہت مشکل ہے۔ حافظ کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں شاہ یحییٰ کے بخل کی طرف خفیف اشارہ ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے کسی خاص وقتی مطلب کے لیے اس کی تعریف کی ہو۔ شاید مالی مشکلات میں گرفتار ہو کر اس امید سے یزد گیا ہو کہ شاہ یحییٰ کی طرف سے کوئی خاطر خواہ مدد مل سکے لیکن نا اُمید ہو کر واپس آ گئے۔ یہ شکایت ایک اور غزل

شہزادوں میں بانٹ دیا۔ شاہ یحییٰ کو شیراز کی حکومت ملی، اور اس کے بیٹے سلطان محمد کو اصفہان کی۔

دیوان حافظ کے بعض قلمی نسخوں میں ایک قطعہ پایا جاتا ہے جس میں تیمور کے فارس پر تسلط کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ایسا ایک قلمی نسخہ تہران کے کتاب خانہ ملی میں موجود ہے اس کے کاغذ اور طرز خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ گیارھویں صدی ہجری میں لکھا گیا ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

نیم تنی ملک سلیمان گرفت — چشم گشا قدرت یزدان ببین
پای نہ و خنگ فلک زیر ران — دست نہ و ملک بزیر نگین
این ہمہ ادمی کند اومی دہد — کیست کہ گوید کہ چنان یا چنین

ابن عرب شاہ نے اپنی تاریخ عجائب المقدور فی نوائب تیمور میں اس قطعہ کو ایک دل چسپ قصہ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ گو اس کا درج کردہ قطعہ بھی مندرجہ بالا متن سے قدرے مختلف ہے۔ چوں کہ عرب شاہ کی تیمور کی تاریخ بڑی مستند ہے اس لیے ہم قصہ کو قارئین کی تفریح طبع کے لیے یہاں درج کرتے ہیں۔

"مولانا محمد الحافظ الخوارزی اپنے وقت کا مشہور گویا اور موسیقی دان تھا۔ اس نے مجھے (عرب شاہ) مندرجہ ذیل حکایت سُنائی۔ امیر تیمور نے ایک سفر میں مجھے (حافظ الخوارزمی) اپنا مصاحب بنایا۔ دن رات اس کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا، ایک بار اس کی فوج نے کسی قلعہ کا محاصرہ کیا۔ تیمور کا خیمہ اونچی جگہ نصب ہوا تھا تاکہ وہ میدان جنگ اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر اپنی نظر دوڑا سکے۔ اس دن خونریز جنگ ہو رہی تھی۔ میرے علاوہ اور دو آدمی اس کے سامنے حاضر تھے۔ تیمور بخار میں مبتلا اور بہت نڈھال اور غمگین تھا۔ اس جسمانی کمزوری کے باوجود میدان جنگ کا حال اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا حکم دیا کہ اُسے ایک دروازے پر لا کر رکھا جائے۔ میں بھی اس کے پاس کھڑا ہوا۔ دو آدمیوں نے سہارا

ادھر مظفری شہزادے باہمی رقابت اور عناد میں گرفتار ہوتے جارہے تھے اور ادھر تیمور کا عضریتی سایہ پھر خاک ایران پر پھیلتا جارہا تھا۔ ۷۸۸ھ ہجری (بقول مطلع السعدین و تاریخ جغرافیائی ۷۸۹ھ) ماوراالنہر اور ترکستان کے بڑے حصے کو قبضہ میں لیا۔ اسی سال اس نے آذربائیجان سے ایک قاصد زین العابدین کے پاس بھیجا کہ میری اطاعت قبول کرو۔ کیوں کہ شاہ شجاع نے مرتے وقت اُسے (زین العابدین) میرے سپرد کیا تھا۔ زین العابدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ ہی قاصد کو واپس جانے کی اجازت دی۔ امیر تیمور اس برتاؤ سے غضبناک ہوا اور ہمدان سے فارس کی طرف چل پڑا۔ اصفہان پہنچ کر زین العابدین کے ماموں مظفر کاشی نے عمایدین شہر کو لے کر اس کا استقبال کیا۔ اور دروازوں کی چابیاں پیش کیں۔ تیمور نے اصفہانیوں کو پہلے تو امان کا وعدہ دیا۔ لیکن دوسرے ہی دن کچھ شہریوں اور تیموری لشکریوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ غالباً لشکریوں نے اہل شہر کے عیال پر دست اندازی کرنی چاہی۔ تیمور نے قتل عام کا حکم دیا۔ اور لگ بھگ سترہ ہزار آدمیوں کو لقمہ اجل بنایا گیا۔ اُن کی کھوپڑیاں ایک مینار کی شکل میں ڈھیر لگوائی گئیں۔ اس دلخراش واقعہ کی پوری تفصیل ظفر نامہ مں درج ہے۔ اصفہان کے قتل عام کا سانحہ حافظؔ کی عمر کے آخری دور میں رونما ہوا۔ ظاہر ہے اس انسان کش سفاکی کا صدمہ انھیں بھی ہوا ہوگا۔ قتل عام کی خبر ملک کے اطراف واکناف میں پھیل گئی۔ شیراز میں لوگ وحشت زدہ ہوئے۔ سلطان زین اللعابدین ے اپنے کچھ امراء اور فوج کی ایک ٹکڑی کو لے کے شوشتر کی راہ لی تاکہ پیش قدمی کرتے ہوئے بغداد کی طرف نکل جائے۔ ادھر کرمان کے سلطان احمد نے تیمور کی اطاعت قبول کی اور حملہ آور کی فوجیں شیراز کی طرف بڑھ کر شہر میں داخل ہوگئیں۔ زیادہ دن نہ ہوئے کہ سمرقند سے بغاوت کی خبر موصول ہوئی اور شیراز سے کوچ کرنے سے پہلے تیمور نے فارس، عراق، اور کرمان کی حکومتوں کو مظفری خاندان کے

یہاں ایکبار پھر اُس قصہ کی طرف رجوع کیا جائے گا جو تیمور اور حافظ کے درمیان اس شعر سے مشہور ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

اس حکایت کا آغاز دولت شاہ سمرقندی کے تذکرہ سے ہوا ہے اور بعد کو مورخوں نے اسی تذکرہ نویس سے نقل قول کیا ہے۔ پروفیسر براؤن کو دولت شاہ سمرقندی کا نہ صرف یہ قصہ بل کہ اور بھی کئی اہم معلومات اور بیانات کی صحت پر شک ہوا ہے۔ کیوں کہ دولت شاہ بڑی لاپروائی کا شکار ہوتا رہا ہے۔ بہر حال اگر یہ داستان درست بھی ہو تو ظاہر ہے کہ ۷۸۹ھ ہجری میں ہی یہ اتفاق ہوا ہوگا نہ کہ ۷۹۴ھ ہجری میں جیسے کہ دولت شاہ نے لکھا ہے۔ عباس اقبال کے پاس علی بن الحسین واعظ کاشفی کی تالیف لطایف الطّوایف کا ایک نسخہ ہے جس کی استنساخ ۱۲۶۷ھ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس کے نویں باب میں لطایف شعرا دیدبہ گفتن کے عنوان کے تحت یہ عبارت درج ہے۔

خواجہ را بملازمت امیر تیمور آورد۔ امیر دید کہ آثار فقر دریاضت براو ظاہر است۔ گفت ای حافظ من بضربت شمشیر تمام روی زمین راخراب کردہ تا سمرقند و بخارارا معمور کردم۔ تو آن را بہ یک خال ہندی بخشی''

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارارا

''خواجہ حافظ گفت کہ ازین بخشند گیہاست کہ بدین

دے کر اس کو اُٹھائے رکھا تھا۔ تا کہ میدان جنگ کا عینی مشاہدہ کر سکے۔ اتنے میں ایک آدمی کو کسی کام سے بھیجا گیا اور اس کی جگہ میں نے تیمور کو سہارا دیا تھوڑی دیر بعد مجھے نیچے بٹھانے کو کہا، کیوں کہ ضعف سے گویا بے جان ہوا جا رہا تھا۔ دوسرا آدمی بھی کسی کام سے چلا گیا اور میں اکیلا اس کے پاس حاضر رہا۔ اُس وقت اس نے کہا میری کمزوری اور جسم کی ناتوانی کو دیکھو۔ نہ میرا ہاتھ ہے کہ کسی چیز کو پکڑ سکوں اور نہ پاؤں کہ بھاگ سکوں۔ اگر کوئی مجھ پر تیر چلائے تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر بولا، دیکھو خدا نے کس طرح لوگوں کو میرا مقہور بنایا اور شہروں کے شہر میرے قبضہ میں دیے۔ میری ہیبت مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ کتنے ہی جابر بادشاہوں کو میں نے مطیع بنایا۔ کیا یہ خدا کے احکام نہیں؟ کیا میں ایک محتاج انسان سے کچھ زیادہ ہوں؟ اس کے بعد اس نے زار زار رونا شروع کیا، حتیٰ کہ میرا لباس تر ہوا، اور مجھے بھی رونا آیا؟ آگے چل کر عرب شاہ لکھتا ہے کہ اِن باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمور جبر کا قایل تھا اور اس کے بارے میں فارسی کے دو شعر کہے گئے ہیں۔

نیم تنی ملک سلیمان گرفت	چشم گشا قدرت یزدان ببین
پای نہ وتحت بہ زیر زمین[1]	دست نہ و ملک بز یر نگین

---

[1] یہ مصرع غلط معلوم ہوتا ہے۔ "...... چوں امیر تیمور ولایت فارس را مسخر کرد وبشیراز آمد وشاہ منصور را بکشت خواجہ حافظ شیرازی راطلبید داو ہمیشہ منزوی بود، بہ فقیر وفاقہ گزارانید سید نورالدین جنابذی[2] کہ نزد امیر تیمور قرمی تمام داشت و مرید خواجہ حافظ بود

[2] اس وزیر کا نام مجمل فصیحی میں آیا ہے۔ سال ۷۲۶ ہجری کے حوادث کے ضمن میں فصیحی نے لکھا ہے۔
"دادن وزارت دیوان حضرت اعلی خاقانی بہ مرتضیٰ اعظم سید زین الدین بن سید نظام الدین محمد الجنابذی و خواجہ نظام الملک تبریزی بشرکت"

تھا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام فارس اور بخصوص شیراز طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے ۔لوگ قحط اور وبا کے شکار ہوئے اور مال و جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ایسے حالات میں کوئی تعجب نہیں حافظ وقت کے حکمرانوں سے آزردہ خاطر ہوئے ہوں۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر اور اہم حصہ میں زبردست سیاسی اور اجتماعی تبدیلیاں دیکھیں۔جن میں آئے دن ایک گروہ کی شکست اور دوسرے کی کامیابی کا سامان ہوتا۔ ہر تبدیلی عوام کی زندگی میں مشکلات کا اضافہ کرتی۔زندگی کے آخری دور میں تو حافظ طاقت فرسا اور صبر شکن سیاسی اوضاع کی بنا پر ناامید ہو گئے تھے۔اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ اُنھوں نے طوائف الملو کی کے شرمناک دور کے خاتمے یا قلع قمع کی صدق دلی سے اارزو کرتے ہوئے دل ہی دل میں امیر تیمور جیسے قرتہار بادشاہ کے ذریعہ حالات میں سُدھار کی اُمید قائم کی ہو۔قاسم غنی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اضافاً مندرجہ ذیل غزل کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا ہے یہ غالباً ۷۸۶ ہجری یا ۷۸۸ ہجری کے درمیان کہی گئی ہوگی جو شاہ شجاع کی وفات اور امیر تیمور کے آذربائیجان کو مسخر کرنے کے درمیان کا زمانہ ہے۔

سینہ مالامال دردست ای دریغا مرہمی
دل زتنہائی بدرد آمد خدارا ہمدمی

لیکن یہ حافظ کی خوش فہمی تھی جس کا احساس جلدی اور کسی ضرر کے پہنچنے سے پہلے ہی ہوا۔تیمور کی سرداری سے حالات میں کوئی خاطر خواہ بہتری نظر میں نہ آئی۔بل کہ اس کے برعکس اس نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دے کر انسان دُشمنی کا پورا ثبوت دیا۔فارس کے لوگ وحشت زدہ ہو گئے اور ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کو اپنے ہمشہریوں اور ہم خیال لوگوں کی طرح اس دل سوز اور جانکاہ عمل سے سخت

فقر و فاقہ افتادہ ام، امیر تیمور خندیدہ برای حضرت
خواجہ وظیفہ تعیین کرد"

اس داستان کی تردید کے لیے بظاہر ہمارے پاس کوئی زوردار دلیل نہیں ۔اس لیے ممکن ہے کہ حافظ اور تیمور کے درمیان ملاقات کے وقت شعر مذکور زیرِ نظر لایا گیا ہو۔ ہم نے پہلے بھی ایک جگہ بتایا ہے ترک شیرازی سے خواجہ صاحب کا اشارہ زین العابدین کی طرف ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ترک نسل کا تھا۔ "شیرازی" کی رعایت سے "ہندو" سمرقند اور بخارا لایا گیا ہے۔ علم معانی کی نظر سے حافظ جس لطیف پیرایہ میں صنعت مراعات النظیر، جناس اور ایہام استعمال میں لائے اس کی کم مثالیں ہوسکتی ہیں۔ شاہ شیخ ابواسحاق اینجو کے خاندان کے ایک شخص شجاع شیرازی نے انیس الناس نام کا ایک رسالہ ۸۰۳ھ ہجری کے آس پاس امیر تیمور کے پوتے مغیث الدین ابوالفتح ابراہیم بن شاہرخ سلطان کے لیے لکھا تھا۔ یہ کلیلہ و دمنہ اور قابوس نامہ کی طرح اخلاقیات اور سیاست منزل کے موضوعات پر رسالہ ہے۔ اس کی ایک حکایت میں حافظ اور تیمور کے درمیان اس بیت کے بارے میں سوال کا اشارہ ملتا ہے۔ شرح احوال حافظ کے دوران ہم نے اس حکایت کو درج کیا ہے۔ اس لیے تکرار سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس حکایت سے البتہ ایک نئی بات کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ کہ شیراز پر تسلط جمانے کے بعد اہل شیراز پر ٹیکس ادا کرنے والوں کی فہرست میں حافظ کا نام شامل کیا جا چکا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے حافظ نے ایر تیمور سے ملاقات کی راہ نکالی۔

ہم پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔ شاہ شجاع کے جانشین نالائق نکلے اور باہمی جنگ و جدل میں اُلجھ کر کمزور ہوتے گئے زین العابدین بڑا غیر مدبر اور بداختیاط بادشاہ ثابت ہوا۔ اگرچہ شاہ یحییٰ کے مقابلہ میں کسی قدر سخی تھا لیکن ایک مضبوط حکومت بحال کرنے کے لیے صرف سخی اور کریم ہونا ہی کافی نہیں

شاہ منصور کے شیراز پر تسلط جمانے اور شاہ یحییٰ کا بغیر مدافعت و مقاومت شیراز ترک کر کے یزد جانے کے سلسلے میں غالباً مندرجہ ذیل کہی گئی تھی

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسیدا

جلال بخت زروی ظفر نقاب انداخت کمال عدل بفریاد داد خواہ رسید

سپہر دور خوش اکنون کند کہ ماہ آید جہاں بکام دل اکنون رسد کہ شاہ رسید

ز قاطعان طرلق اینزمان شود ایمن قوافل دل و دانش کہ مرد راہ رسید

عزیز مصر برغم براا وران غیور ز قعر چاہ برآمد باوج ماہ رسید

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ رسید

صبا بگو کہ چہا برسرم درین غم عشق ز آتش دل سوزان و دود آہ رسید

زشوق روی تو شاہا بدین اسیر فراق ہمان رسید کہ اآتش ببرگ کاہ رسید

مرد بخواب کہ حافظ ببارگاہ قبول

ز درنیم شب ددرس صبح گاہ رسید

تھوڑی دیر کے لیے ہم اصل موضوع سے ہٹ کر اس غزل کے چھٹے شعر کی طرف متوجہ ہوں گے جس میں ''صوفی دجال چشم ملحد شکل'' کی اصطلاح لائی گئی ہے۔ اس کا اشارہ امیر تیمور کی طرف ہے۔ اکثر مورخوں نے؛ لکھا ہے کہ تیمور صوفی مشائخ اور خانقاہوں کے مجاوروں سے عقیدت کا اظہار اور اِن سے دعا ہمت کی درخواست کرتا تھا۔ اس خیال کی بنیاد مضبوط ہے۔ مثلاً شرف الدین یزدی نے ظفر نامہ (جلد اوّل صفحہ ۷۷) میں لکھا ہے کہ

''امیر حسین اور حضرت صاحب قرانی نے پورے لشکر کو لے کر وہاں سے کوچ کیا اور خزار کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں خواجہ شمس الدین کے مزار متبرکہ کی زیارت کی اور دین کے اس بزرگ کی روح قدس

دُکھ اور نفرت ہوئی ہوگی۔ مختصر یہ کہ بجائے اس کے کہ ایک طاقتور حکومت برسرکار آئے اور بے نوا اور فاقہ مست لوگوں کو مصیبتوں سے نجات دلائے اِن کی بدبختی اور بے چارگی میں آضافہ ہی ہوا۔ یہ ایک زہریلی ہوا تھی جو خواجہ حافظؔ کے باغ و گلستان میں چلی۔ ایسے حالات میں اُنھوں نے ترک سمرقندی کے ساتھ خیالی عشق کو فوراً ترک کیا اور درج ذیل غزل اِن بدلے ہوئے حالات میں شاعر کے عکس العمل کی نشاندہی کرتی ہے:۔

دو یار زیرک داز بادہ کہن دوہنی فراغتی و کتابی و گوشہ چمنی

الخ............

شوشتر سے زین العابدین نے بغداد کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن جب اُسے خبر ملی کہ تیمور واپس سمرقند چلا گیا ہے۔ تو وہ بھی بغداد کے ارادے سے منحرف ہو کر شیراز کی طرف چل پڑا۔ لیکن شاہ منصور کی ایک چال کے نتیجے میں وہ قید ہوا۔ شیرازیوں نے جب سُنا کہ شاہ منصور شیراز کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اِن کی گرمجوشی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شاہ یحییٰ کی بُری خصلت سے تنگ آ چکے تھے۔ شاہ منصور دلیری اور جانبازی میں مشہور تھا۔ شیراز پہنچ کر وہ شاہ شجاع کے بنائے ہوئے ایوان میں اُترا۔ ادھر شاہ یحییٰ شیراز چھوڑ کر یزد کی طرف جا نکلا۔

شاہ منصور:۔

حافظؔ نے شاہ منصور کی مدح میں کئی مشہور اشعار کہے ہیں۔ مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بادشاہ سے خلوص اور محبت رکھتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ حافظؔ نے اپنے ہم عصر امرا یا سلاطین میں کسی اتنی پرزور تعریف نہیں کی ہے جتنی شاہ منصور کی۔ ایسی غزلیں اِن کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ فکر نہایت پختہ ہو چکی تھی۔

درجہ ذیل قطعہ میں حافظ نے شاہ منصور کے حق میں دعا کی ہے

روح القدس آن سروش فرخ　　برقبۂ طارم زبرجد
میگفت سحر گہی کہ یارب　　در دولت و چشمت مخلد
بر مسند خسروی بماناد　　منصور مظفر محمد

یہاں تک جن تاریخی واقعات کا ذکر ہوا وہ ۷۸۹ ہجری تک ہی پھیلے ہوئے ہیں۔ حافظ کی وفات ۷۹۲ ہجری میں واقعہ ہوئی۔ اس لیے قبل ازین کہ ہم تاریخ کے اس باب کو بند کریں مناسب ہوگا مظفری خاندان کے زوال کی درد ناک کہانی کو بھی بیان کیا جائے تاکہ ایک صدی تک برسر اقتدار رہنے کے بعد اس خاندان کا انجام بھی معلوم ہو جائے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حافظ کے آخری ایام میں جب کہ وہ پیری اور ضعف سے دوچار ہو رہے تھے اپنے معاصر بادشاہ اور اُن کی شان نزول کے بارے میں اپنی معلومات کو قلمبند کریں گے۔

جب شاہ منصور نے شاہ یحییٰ کو شیراز سے بھگایا اور خود فارس کی حکومت پر قابض ہوا تو اہل قلم میں سے کئی نے اس کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کی مکارانہ غرض سے اہل علم کے وظیفہ میں تخفیف کی جن وظیفہ خواروں پر اس حکم کا اثر آن پڑا اِن میں حافظ بھی شامل تھے۔ جب اُن کی صدائے احتجاج شاہ منصور تک پہنچی تو اس نے اہل کاروں کو بلا کر بڑی ملامت کی اور کہا کہ میرے بزرگوں نے اہل علم کے لیے جو بھی وظیفہ مقرر کیا ہے۔ وہ کسی تخفیف یا کسر کے بغیر انھیں باقاعدہ ملنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ اہلکار نے پچیس فیصد کا حکم جاری کیا تھا، یعنی یہ مقرر کیا تھا کہ بجائے دس کے ساڑھے سات ادا کیے جائیں۔ جب شاہ منصور نے ساڑھے سات (ہفت و نیم) کو پھر دس میں بدل دیا یعنی تخفیف کو رد کیا تو حافظ نے یہ قطعہ لکھ کر خدمت میں پیش کیا۔

دیوان حافظ میں پچیس اشعار کی ایک غزل ملتی ہے جس میں شاہ منصور کی مدح کی گئی ہے۔ اکثر نسخہ میں اس منظومہ کو غزلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن اشعار کی تعداد۔ اسلوب بیان اور حیثیت مضمون کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل شاہ منصور کی مدح میں قصیدہ ہے۔ کئی قلمی نسخوں میں واقعی طور پر اس کو قصیدوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مطلع یہ ہے

جوزا سحر نہاد حمایل برابرم
یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

درج ذیل تین غزلوں کا روئے سخن بلاشک وشبہ شاہ منصور ہی کی طرف ہے،

الا ای طوطی گویای اسرار   مبادا خالیت شکر ز منقار

....

گرچہ ما بندگان پادشہیم   پادشاہان ملک صبح گہیم

....

نکتہ ی دلکش بگویم خال آن مہرو ببین   عقل و جان رابستہ زنجیر آن گیسو ببین

حافظ سے منسوب ساقی نامہ میں بھی شاہ منصور کو یاد کیا گیا ہے۔

باقبال دارای دیہیم و تخت   بہین میوہ خسروانی درخت
خدیو زمین پادشاہِ زمان   مہ برج دولت شہ کامران
خدیو جہانشاہ منصور رباد   غبار غم از خاطرش دور باد
بحمد اللہ ای خسرو جم نگین   شجاعی بمیدان دنیا و دین
بمنصوریت شد در آفاق نام   کہ منصور بودی بر اعدا مدام

............الخ

رسیدہ بود شاہ منصور ایشان را نوید عدل داد و الحق بجای
آورد و یکی از وزرا مُیاومیات (بمعنی وظیفہ) ارباب
عمایم را مبلغ ہفتاد تومان بود خواست کہ بہ نصف آورد
،شاہ غضب فرمود ما این مردم را وعدہ عدل دادہ ایم
چگونہ میادمہ کہ آباد و اجداد ما دادہ باشند ناقص کنیم۔
فرمود کہ از آنقدر وجوہ ساختہ بسوئت قسمت کنند و
فرمود کہ ما دو لشکر داریم۔صوری شمایید و معنوی سادات
و علما و مشائخ و محتاجان، فی الجملہ اہل فارس بقدوم او
استبشار نمودند و جراحات خدنگ، حوادث بمرحم
مرحمت او التیام یافت مولانا حافظؔ شیراز کارنامہ در
آن ایام فرماید۔"

جو ز اسحر نہاد حمایل برابرم
یعنی غلام شاہم وسوگند میخورم

شاہ منصور کی مدح میں حافظؔ کی ایک اور غزل ہے۔اس میں کل تیرہ شعر
ہیں مطلع یوں ہے۔

من نہ آن رندم کہ ترک ساغر و شاہد کنم
محتسب داند کہ من این کارہا کمتر کنم
اسی غزل میں شاہ منصور کی مدح میں ایک شعر ہے جو عام نسخوں میں نہیں

پادشاہا لشکر توفیق ہمراہ تواند   خیز اگر بر عزم تسخیر جہان رہ میکنی
با چنین جاہ وجلال از پیش گاہ سلطنت   آگہی وخدمت دلہای آگہ میکنی
با فریب رنگ این نیلی حسم زنگار فام   کار بر وفق مراد صبغۃ اللہ میکنی
آنکہ دہ با ہفت ونیم آورد بس سودی نکرد   فرصتت بادا کہ ہفت ونیم بادہ میکنی

قزوینی کے مطبوعہ دیوان حافؔظ میں ایک قطعہ حافؔظ نے کسی شخص (خواجہ) سے مخاطب ہو کر لکھا ہے۔ اس میں وظیفہ کی گزارش کی گئی ہے۔ یہ خواجہ کون تھا، معلوم نہ ہو سکا۔ قطعہ یوں ہے۔

بہ سمع خواجہ رسان ای ندیم وقت شناس
بخلو تیکہ درو اجنبی صبا باشد

لطیفہ ای بمیان آرد خوش بخند انش
بہ نکتہ ایکہ دلش را بدان رضا باشد

پس آنگہش ز کرم این قدر بلطف بپرس
کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

کہا جاتا ہے کہ شاہ منصور نے اہل قلم کا سابقہ وظیفہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تو خواجہ حافظ نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ اس ضمن میں مطلع السعدین کی متعلقہ عبارت کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''شاہ منصور تخت فارس را کہ مدتہا در ارزوی آن بود با آسان ترین وجہی مسخر ساخت وچون در آن دلا انواع بلا کہ از شرح استغنا دارد بہ متوطنان فارس

اس حکایت پر یقین کرنے کے لیے غزل کا یہ شعر موثر رہا ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیاں ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

پروفیسر براؤن نے تو شبلی ہی سے نقل قول کیا ہے اور اس مقولہ کی صحت یا عدم صحت کی تمام ذمہ داری شبلی پر ہی ڈالی ہے۔ لیکن کچھ محققوں نے اس بات کو غلط اور بے بنیاد بتایا ہے۔ اِن کا کہنا ہے کہ یہ سلطان غیاث الدین شاہ منصور کے چچا اور شاہ شجاع کے بھائی، عماد الدین (جس کا نام اوپر آیا ہے) کا بیٹا تھا۔ آلِ مظفر سے متعلق تواریخ میں بارہا سلطان غیاث الدین کا ذکر آیا ہے۔ اِن میں حافظ ابرو اور محمود گیتی، دونوں کی تاریخیں شامل ہیں جو ہر لحاظ سے معتبر ہیں
ڈاکٹر غنی کا یہ قول درست نظر آتا ہے کہ

"سلطان" مظفری خاندان کے بادشاہوں کے نام کا[1]
حصہ ہے۔ نہ صرف لقب مثلاً سلطان اویس، سلطان
احمد، سلطان مہدی، وغیرہ اتنا ہی نہیں بل کہ شاہ شجاع
کی بیٹی کا نام سلطان پادشاہ تھا۔"

اس لیے شعر مزکور میں سلطان غیاث الدین کا نام ہے نہ کہ سلطان بنگال، اس دلیل کے پیش نظر ممکن ہے کے شعر کا اشارہ اسی سلطان غیاث الدین بن عماد الدین کی طرف ہو جو باقی بد بخت مظفری شاہزادوں کے ساتھ تیمور کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۷۹۳ ہجری میں شاہ منصور نے اصفہان پر چڑھائی کی اور سلطان زین العابدین کو وہاں سے بھگا دیا۔ لیکن اب کی بار اس کا تعاقب کرتا رہا اور ری یا تہران کے قریب اُسے پکڑوا کر اُسے نابینا کروا دیا گیا۔ اگلے سال متواتر یہ خبر آتی رہی کہ تیمور سمرقند سے نکل کر ایران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شمال، خراسان،

ملتا صرف ملا سودی کی شرح میں اسے دیکھا گیا اور مطلع سے دو بیت پہلے درج ہوا ہے شعر یہ ہے۔

من غلام شاہ منصور بنا شد دور اگر
از سر تمکین تفاخر بر شہ خاور کنم

۷۹۲ھ ہجری میں شاہ منصور نے اصفہان کو مسخر کرنے کی ٹھانی تا کہ سلطان زین العابدین کی طرف لاحق ہونے والے کسی بھی خطرے کا سد باب کیا جا سکے۔ لیکن اسی کے ساتھ سلطان زین العابدین نے سلطان احمد اور ابو اسحاق کو ساتھ ملا کر شیراز پر لشکر کشی کی غرض سے حرکت کی۔ شاہ منصور کو مجبور ہو کر شیراز کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ اور فسا کے قریب دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں شاہ منصور کامیاب ہوا۔ سلطان زین العابدین کی فوج کی ایک ٹکڑی کی کمان سلطان عماد الدین کرر ہا تھا۔ وہ شاہ منصور کا چچا اور شاہ شجاع کا بھائی تھا۔ اس کی فتح کے بعد شاہ منصور بڑی فراغت سے شیراز اور اس کی نواحی، بل کہ فارس کی حکمرانی کرتا رہا۔

عماد الدین کا نام اوپر لیا گیا۔ اس سے منسوب ایک دل چسپ قصہ کو یہاں درج کرنا چاہیے جو حافظ کی ایک غزل سے متعلق ہے۔ دیوان حافظ میں اس مطلع کی مشہور غزل ہے۔

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ میرود
وین بحث با ثلاثہ غسالہ میرود

شبلی نعمانی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ غیاث الدین بنگال کا سلطان تھا۔ اُس نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن حافظ نے معذرت چاہتے ہوئے یہ غزل شکرانہ کے طور پر بھیجی۔ شبلی نے اس حکایت کو کس تذکرہ سے نقل کیا ہے۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ شبلی اور اکثر ہندوستانی تذکرہ نویسوں کے لیے

لشکریوں سے تھی۔ جنگ کی رات شاہ منصور نے ایک انتہائی سرکش گھوڑے کی دم کے ساتھ کانسی کی بڑی دیگ مضبوطی سے باندھی اور اُسے دشمن کی صف میں لاکر چھوڑا۔

گھوڑا بے تحاشا بپھرا، سہما، ہوا تیموری صفوں میں بے بندوبار دوڑتا بھاگتا رہا۔ اس قدر شوروغل بپا ہوا۔ گویا شورمحشر تھا۔ شاہ منصور ایک طرف کمین میں بیٹھا تھا۔ تیموری لشکر کی ٹکڑیاں ادھر اُدھر تتر بتر ہوگئیں۔ اور صبح تک منصور کے سپاہیوں نے اِن کی خاسی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دن چڑھتے شاہ منصور کے پاس صرف پانچ سو دلیر اور جان باز سپاہی ساتھ تھے۔ اس نے شیر نر کی طرح تیموری صفوں پر حملہ کیا ، اور دائیں بائیں تارو مار کرتا رہا۔ محاربہ کے دوران زور سے للکارتا رہا۔ منم شاہ منصور"۔ "منم شاہ منصور، تیموری لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے اور شاہ منصور اس مقام پر تاخت کرسکا۔ جہاں تیمور تھا۔ وہ بھاگا اور سر پر نقاب ڈال کرر عورتوں میں روپوش ہوا ۔ جب شاہ منصور وہاں پہنچا تو عورتوں نے چیخ چیخ کر کہا ہم عورتیں ہیں۔ اور تیمور جس کو تم ڈھونڈ رہے ہو۔ میدان جنگ کے فلاں نقطہ میں ہے۔ منصور اس جگہ کی طرف جانکلا جس طرف عورتوں نے اشارہ کیا تھا اور دائیں بائیں اس قدر شمشیر زنی کی کہ اس کے بازو

مازندان، اور سلطانیہ سے گزر کر سال ۷۹۵ ہجری میں وہ عراق وعجم کی طرف متوجہ ہوا۔ شوشتر اور دزفول سے ہوتا ہوا فارس میں داخل ہوا۔ اس کی پیش قدمی کی خبر شاہ منصور کو برابر ملتی رہی۔ پہلے تو فرار کا ارادہ کیا لیکن بعد میں اس سے منصرف ہو کر مقاومت کو مناسب سمجھا۔ شاہ منصور نے جس دلیری اور شجاعت سے اس عظیم قہار اور زبردست فاتح کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہ تاریخ ایران، بل کہ ساری دُنیا میں شجاعت کی معدودے چند مثالوں میں شامل ہے۔

مورخوں نے اس خون ریز جنگ کی تفصیل وضاحت سے درج کی ہے۔ اس بارے میں ہم ابن عرب شاہ کی تاریخ عجائب المقدور میں مندرجہ عبارت کو عیناً لیکن مختصر طور پر نقل کریں گے۔

"...........شاہ منصور نے شہر شیراز کی مدافعت کی جو اسکیم بنائی تھی کچھ حالات کی مجبوری کی بنا پر اس میں تبدیلی کرنا پڑی۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ تیمور کی یلغار کے سامنے سے ہٹ جانا بہتر ہوگا۔ لیکن شہر کی کچھ بد بخت بوڑھی عورتوں نے شاہ منصور کی ملامت کرنا شروع کی یہ "ترکش بحرام" ہمارے مال اور خون پر حکمران تھا لیکن وقت ضرورت ہمیں دشمن کے ہاتھوں میں دے رہا ہے۔ خدا اسلحہ اس پر حرام کرے۔ اس ملامت سے اس کی حس غیرت جنبش میں آئی۔ اس کی عقل اندھی ہوگی اور حمیت جاہلیہ اس پر غالب آئی۔ طے شدہ تدبیر سے منحرف ہوا اور مصمم ارادہ کیا کہ وہاں ہی ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ بدقسمتی سے اس کے ملازموں میں ایک غداز نکلا جس کی راہ و رسم تیمور اور اس کے

کرتا رہا۔ اور اس کی شہامت و دلیری کے بڑی تعر
یف کی۔ شیراز میں داخل ہوکر تیمور نے شاہ منصور کے
خزینہ دفینہ اور دیگر ذخیروں پر قبضہ کیا اور لوگوں کا مال
وجایداد زبردستی چھین لیا۔''[1]

جب وہ تیمور کی طرف لپکا، تیمور نے چاہا اس پر نیزہ مارے، لیکن نیزہ دار جنگ کے ہول سے بھاگ گیا تھا۔ شاہ منصور بجلی کی طرح کوندھا اور دو بار تیمور پر شمشیر کے وار کیئے۔ اگر عبدلا اختاجی سپر کو بلند نہ کرتا تو اس دن تیمور، شاہ منصور کے ہاتھوں ہلاک ہوا چاہتا تھا۔

شیراز کے شمال میں ''گور منصور'' یا ''تل منصور'' نام کی ایک جگہ پر مقبرہ ہے جس کی ظاہری شکل وصورت ایران کے امام باڑوں کی سی ہے یعنی بقعہ، ضریح، اور قندیل کے لحاظ سے یہ امام باڑہ لگتا ہے۔ ڈاکٹر غنی نے کئی بار اس جگہ کو غور سے دیکھا ہے لیکن قدیم تاریخ کا کوئی نشان وہاں نہیں ملتا۔ لوگ اس کو ''مقبرہ شاہزادہ منصور'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس جگہ زیارت نامہ کے عنوان سے چند تختیاں بھی ہیں۔ ایک پر یہ عبارت لسلام ہے۔

''اسلام علیک یا شاہزادہ منصور درحمۃ اللہ وبرکاۃ

اس واقعہ کے ساتھ مظفری خاندان کا چراغ گل ہونے لگا۔ اور اِن کا حتمی خاتمہ ایک دلدوز اور عبرت ناک واقعہ کے ساتھ ہوا۔

امیر تیمور نے حکم دیا کہ اس خاندان کے تمام شہزادے اس کے سامنے لائے جائیں چناں چہ یک بہ یک سبھی کو حاضر کیا گیا۔ اِنمیں یہ لوگ شامل تھے۔

(ا) سلطان عمادالدین (مبارزالدین کا بیٹا اور شاہ شجاع کا بھائی)

---

[1] کریم خان زند کے منشی میرزا محمد کرمانی نے خلاصۃ العلوم کے منتخب ''لب خلاصۃ العلوم کی ساتویں اور آخری جلد میں ایک جگہ لکھا ہے ''قبر شاہ منصور در یک فرسخی شیراز است

تھک کر چور ہو گئے۔ اس کے ساتھیوں میں صرف دو شخص توکل اور مہتر فخر اس کے ساتھ رہ گئے۔ کئی کاری زخم کھا کر شاہ منصور رنڈھال اور تشنگی سے جان بلب ہوا۔ لیکن پانی میسر نہ ہو سکا۔ اگر اسے پانی پینے کو ملتا تو کس کی مجال تھی کہ اس پر غالب آتا اس کا راستہ مسدود کرتا۔ پیاس کی شدت سے بے جان ہو کر وہ مقتولوں میں جا گرا۔ توکل بھی مارا گیا لیکن مہتر فخر بچ نکلا۔ اس شخص کے جسم پر اگرچہ ستر زخم تھے لیکن طویل عمر پا کر نوے سال کی عمر میں فوت ہوا امیر تیمور نے شاہ منصور کو ڈھونڈنے اور اپنے سامنے لانے کا حکم دیا۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک چغتائی سپاہی شاہ منصور کے قریب آیا۔ وہ مجروح اور رنڈھال مقتولوں کے درمیان پڑا تھا۔ چغتائی سپاہی سے کہا کہ میرے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے اسے لو اور مجھے زندہ رہنے دو یا میرے لواحقین کے سپرد کر دو میں اس بھلائی کا نیک بدلہ تمہیں دوں گا۔ چغتائی سپاہی پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا سر تن سے جُدا کر کے تیمور کے سامنے پھینکا۔ تیمور کو شک ہوا شاید یہ منصور کا سر نہیں لیکن ایک جماعت نے اس کے چہرے پر سیاہ خال دیکھ کر تصدیق کی[1]۔ امیر تیموراس موت پر افسوس

---

[1] کوئی تعجب نہیں کہ حافظ کے مشہور شعر کا شارہ شاہ منصور کیطرف ہو

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا بخال ھندویش بخشم سمرقند و بخارا۔ را

چوخر مانبان در زمانی برستند چوتره به اندک زمانی دردند

مظفری خاندان میں سے صرف سلطان زین العابدین اور سلطان شبلی بچ گئے۔ لیکن وہ دونوں نابینا کر دے گئے تھے۔ امیر تیمور نے اِن دونوں کو سمرقند بھیجوا دیا۔ جہاں دونوں طبعی موت مرے۔ چناں چہ اس طرح حافظ کی وفات کے صرف تین سال بعد مظفریوں کا خاتمہ ہوا۔

ابن عربشاہ نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔ ملوک عراق کے آٹھارہ آدمی اس کے پاس جمع ہوگئے۔ یہ سب بادشاہ، شاہزادے اور بادشاہوں کے بھتیجے وغیرہ تھے۔ اِن میں سے ہر ایک عراق، عجم کے کسی حصے پر تسلط رکھتا تھا۔ مثلاً سلطان احمد شاہ یحییٰ وغیرہ، ایک دن اتفاق سے یہ جماعت امیر تیمور کے خیمے میں اس کے سامنے اکھٹی ہوئی اور امیر تیمور ان کے درمیان اکیلا تھا۔ اِن میں سے ایک نے شاہ یحییٰ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اس پر حملہ کرے اور قتل کرے۔ تیمور اس کی نیت کو جان گیا۔

کچھ دن بعد تیمور جلسہ عام میں سُرخ لباس پہن کر آیا اور اِن آٹھارہ ملک زادوں کو بلوایا اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیا۔ فی الفور اُن کو نابود کر دیا گیا، (عجائب المقدور صفحہ ۱۳۶)

مظفری خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا اور حافظ کی پیشین گوئی گویا درست ثابت ہوئی جو امیر مبارز الدین کے ذریعے شیخ ابواسحاق پر کیے گئے ظلم وستم کے بارے میں کی گئی تھے۔

اگر چہ خصم تو گستاخ میرود حالی
تو شاد باش کہ گستاخیش چناں گیرد
کہ ہر چہ حق این خاندان دولت کرد

(۲) سلطان مہدی (شاہ شجاع کا بیٹا اور سلطان احمد کا داماد)

(۳) شاہ یحییٰ اور اس کے فرزند سلطان محمد اور معزالدین جہانگیر حکمرانان یزد)

(۴) سلطان ابو اسحاق (شاہ شجاع کا پوتا اور سلطان اویس کا بیٹا)

حکمران سیرجان

(۵) سلطان غضنفر (شاہ منصور کا بیٹا) شیراز

(٦) سلطان غیاث الدین (سلطان عماد الدین کا بیٹا) کرمان

دربار میں حاضر ہونے کے بعد تیمور نے اِن سے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ موافقت کرتے تو اُس وقت میرے لشکر کے ساتھ مل جاتے جس وقت میں رے اور سادہ میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

تم اس انتظار میں تھے کہ میرے اور شاہ منصور کے درمیان کس کا پلہ بھاری ہو جائے تا کہ اسی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ

بہر حال اِن سب شہزادوں کو قید کیا گیا۔ امیر تیمور نے امرا کے ساتھ اِن کے بارے میں مشورہ کیا سبھوں نے یہ رائے دی کہ مظفری شہزادوں کا کرمان اور فارس میں بہت زیادہ اثر رسوخ ہے۔ اگر رہا کیے۔ جائیں تو قلیل مدت میں اپنے ہاتھ پھر مضبوط کریں گئے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اِن کا خاتمہ کیا جائے۔ تیمور کو یہ رائے موافق آئی۔ چوں کہ تیمور کی فوجیں اصفہان کی طرف کوچ کر رہی تھیں اس لیے یہ شاہزادے بھی قیدی بنا کر نگرانی کے تحت ساتھ لئے جا رہے تھے اصفہان کے قریب ماہ یار کے مقام پر اِن سبھوں کو تیمور کے حکم سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

اس زمانے میں کسی شاعر نے اس واقعہ سے متعلق یہ قطعہ کہا ہے۔

بہ عبرت نگہ کن کہ آل مظفر	شہانی کہ گوی از سلاطین ربودند
کہ در ہفتصد و خمس و تسعین ز ہجرت	دہم شب ز ماہ رجب چون غنودند

کتب حوالہ جات

جزاش درزن وفرزندوخان ومان گیرد

تمام شد

۲۱۔ حافظ تشریح	عبدالحسین ہژیر۔ تہران
۲۲۔ خلاصۃ الافکار	....
۲۳۔ خلاصۃ الاشعار	....
۲۴۔ خزانہ عامرہ	آزاد بلگرامی۔ تہران
۲۵۔ دیوان سعدی شیرازی	تہران ایڈشن
۲۶۔ دیوان حافظ	مرتبہ حسین پژمان۔ تہران
۲۷۔ دیوان حافظ	مرتبہ ہاشم رضی۔ تہران
۲۸۔ دیوان روح عطار	مربتہ ہاشم رضی۔ تہران
۲۹۔ دیوان کمال خجندی	مربتہ ہاشم رضی۔ تہران
۳۰۔ دیوان حافظ	مرتبہ مجید یکتائی۔ تہران
۳۱۔ دیوان حافظ	مرتبہ قزوینی و قاسم غنی۔ تہران
۳۲۔ در مکتب استاد	سعید نفیسی۔ تہران
۳۳۔ درسی از دیوان حافظ	سعید نفیسی۔ تہران
ریاض الشعرا	واللہ داغستانی۔ تہران
۳۴۔ سخنی چند در باب احوال	مجدزادہ صہبا۔ اصفہان ۱۳۲۱
واشعار حافظ	فرحت اللہ شیرازی
۳۵۔ شرح سودی بر حافظ	عصمت ستارزادہ۔ تہران ۱۳۶۱
۳۶۔ شیراز	حسن امداد۔ تہران
۳۷۔ شرح حال لسان الغیب	سیف پور فاطمی۔ تہران
۳۸۔ ظفر نامہ	نظامی شامی۔ بیروت
۳۹۔ ظفر نامہ	شرف الدین علی یزدی
۴۰۔ فارس نامہ	ابن بلخی۔ تہران

فہرست حوالہ جات

۱۔ از سعدی تا جامی — علی اصغر حکمت۔ تہران

۲۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم — محمد بن قیس رازی۔ تہران

۳۔ اشعار و احوال حافظ — سعید نفیسی۔ تہران

۴۔ الہامات خواجہ حافظ — محمو علی بامداد تہران

۵۔ الجماہر نی معرفت الجواہر — البیرونی۔ حیدر آباد دکن

۶۔ آتش کدہ آذر — آذر بیگد لی۔ تہران

۷۔ بہارستان — عبدالرحمان جامی۔ تہران

۸۔ تاریخ جدید یزد — احمد بن حسین بن علی الکاتب۔ تہران

۹۔ تاریخ جہانگشائی — عطا ملک جوینی۔ تہران

۱۰۔ تاریخ عصر حافظ (۲) جلد — ڈاکٹر قاسم غنی۔ تہران

۱۱۔ تاریخ جغرافیائی — حافظ ابرو۔ تہران

۱۲۔ تاریخ فرشتہ

۱۳۔ تاریخ آل مظفر — ....

۱۴۔ تاریخ وصّاف — وصاف الحضرت۔ تہران

۱۵۔ تذکرہ میخانہ — فخر النبی۔ تہران

۱۶۔ تذکرۃ الشعرء — دولت شاہ سمرقندی

۱۷۔ جامع التواریخ — حسن بن شہاب الدین یزدی۔ تہران

۱۸۔ حبیب السیر — خواندمیر

۱۹۔ حافظ نامہ — عبدالرحیم خلخانی۔ تہران

۲۰۔ حافظ شیرین سخن — محمد معین۔ تہران

۴۱۔ عرفات العاشقین	ابن بلخی۔ تہران
۴۲۔ فارس نامہ	ابوالعباس زرکوب۔ تہران ۱۳۱۰
۴۳۔ قصاید	ملک الشعرا بہار
۴۴۔ کشف الاسرار	محمو افضل آلہ آبادی۔ ہند
۴۵۔ کشف الظنون	حاجی خلیفہ۔ مصر
۴۶۔ کلیات عبید زاکانی	مرتبہ عباس اقبال۔ تہران
۴۷۔ مجلّہ یغما، شمارہ ۳	خرداد ۱۳۳۸ تہران
۴۸۔ مجالس النفائس السعدین	میر علیشر نوائی۔ تہران
۴۹۔ مطلع السعدین	عبدالرزاق سمرقندی۔ ہند
۵۰۔ مجمع الفصحا	رضا قلی خان ہدایت۔ تہران
۵۱۔ مجالس العشاق۔	رضا قلی خان ہدایت۔ تہران
۵۲۔ مجموعہ تاج الدین وزیر	(قلمی نسخہ، کتاب خانہ مجلس شوائی۔ تہرن
۵۳۔ نزہت القلوب	حمداللہ متوفی۔ تہران
۵۴۔ نقشی ار حافظ	علی دشتی۔ تہران
۵۵۔ نفحات الانس	جامی۔ تہران
۵۶۔ ہفت اقلیم	امین الدین رازی